زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہ نامہ

اکتوبر ۲۰۲۳ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہ نامہ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

جلد ۱ شمارہ ۳ اکتوبر ۲۰۲۳ء ربیع الاوّل ۱۴۴۵ھ

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس مدیر انتظامی: فرحان سید

مجلس تحریر: ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

معاون مدیر: شاہد محمود

فہرست

شذرات

قرآنِ مجید میں نظم کلام—ایک تنقید کا جائزہ — سید منظور الحسن — 3

انسان کو آزمایش میں کیوں ڈالا گیا؟ — محمد حسن الیاس — 14

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 21-39 (2) — جاوید احمد غامدی — 18

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 22

مقامات

قافلہ در قافلہ — جاوید احمد غامدی — 23

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (3) — سید منظور الحسن — 33

نقد و نظر

تختِ سلیمان کے دھڑ کی حقیقت — نعیم احمد بلوچ — 39

علامہ شبلی نعمانی اور امام حمید الدین فراہی پر فتوائے تکفیر — حسان عارف — 52

نقطۂ نظر

جبری تعلیم — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 61

مختارات

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ — سید مناظر احسن گیلانی — 66

سیر و سوانح

حیاتِ امین (2) — نعیم احمد بلوچ — 69

ادبیات

شہر آشوب — جاوید احمد غامدی — 83

صبحِ درخشاں (بچوں کے لیے)

اللہ کا اپنے بندوں پر حق (منظوم حدیث) — سید منظور الحسن — 85

حالات و وقائع

خبر نامہ "المورد امریکہ" — شاہد محمود — 88

سید منظور الحسن

قرآنِ مجید میں نظم کلام ـــــ ایک تنقید کا جائزہ

نظم کلام کے تصور پر جناب احمد جاوید صاحب کی گفتگو اُن کے موقف کی فی نفسہٖ شہادت ہے۔[1] بلاشبہ وہ فرد فرد خیالات کا مجموعہ، پریشان افکار کا مرقع اور نامربوط تاثرات کا آمیختہ ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ غالباً وہ قرآنِ مجید کے ساتھ انسانی کلام میں بھی ربط و ارتباط کے قائل نہیں ہیں۔ ''نظم قرآن کے ایک تصور پر تنقید'' کے زیرِ عنوان اُنھوں نے استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے فکر کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور بعض تنقیدی مفردات بیان کیے ہیں۔ اِن میں سے چند نمایاں درجِ ذیل ہیں:

1۔ غامدی صاحب کا تصورِ نظم قرآن اُن کی تعبیرِ دین کی بنیاد ہے۔ اِس تصور نے دین کی ایک منفرد اور جامع و مانع تعبیر کو وجود بخشا ہے۔ نتیجتاً علماے دین کی مستند، مسلم اور مقبول روایت ناقابل اعتبار ٹھہری ہے۔

2۔ غامدی صاحب کے اصولِ تفسیر میں نظم کلام کا تصور قرآنِ مجید سے مقدم ہے۔ لہٰذا وہ

---

[1]۔ یہ گفتگو اِس لنک کے تحت ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

https://www.youtube.com/watch?v=mu5ITMjKL98&ab_channel=AhmadJavaid

اِس کی روشنی میں کتابِ الٰہی کو سمجھتے اور اِس کی متابعت میں اُس سے احکام کا استخراج کرتے ہیں۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایسا تصور جو قرآن کے متن سے خارج اور اُس کے وجود سے ماورا ہے، اُسے فہم قرآن کی واحد لازمی شرط بنا دیا گیا ہے۔ یہ اللہ کی کتاب کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے۔[2]

3۔ اِس غلطی کا سبب کتاب الٰہی کو انسانی کتابوں کی ساخت پر محمول کرنا ہے۔ گویا یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جس طرح انسانی کلام ایک نظم و ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، اُسی طرح الہامی کلام کو بھی منظم و مرتب کر کے نازل کیا گیا ہے۔ یہ ایک خطرناک مغالطہ ہے۔ اِس کے نتیجے میں کلام الٰہی ہمارے مفروضہ اصول میں مقید ہو جاتا ہے۔ اِس طرح کے اصول و قواعد انسانی کلام کے لیے تو استعمال کیے جا سکتے ہیں، مگر کلام الٰہی کے فہم کو محل خطر میں لا سکتے ہیں۔

4۔ غامدی صاحب کا یہ قول درست نہیں ہے کہ ”قرآن کی ہر سورہ کا ایک متعین نظم کلام ہے۔“ اِسی طرح مولانا اصلاحی کی بھی یہ بات غلط ہے کہ ”جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن کو پڑھے گا، وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا، وہ کچھ منفرد احکام اور مفرد قسم کی ہدایات ہیں۔“ اِن اقوال کی تردید کی دلیل یہ مسلمہ امر ہے کہ متعین چیز مخفی نہیں ہو سکتی۔ اُسے لازماً واضح اور غیر مبہم ہونا چاہیے اور ہر صاحبِ علم کو کسی تحقیق یا تاویل کے بغیر اُسے سمجھ لینا چاہیے۔ اِس بنا پر دیکھیے تو ہماری مذہبی علمی روایت کی واقعاتی شہادت سے نظم قرآن کے تصور کی تردید ہو جاتی ہے۔ سلف و خلف کے علما کا کام شاہد ہے کہ اُنھوں نے کسی مفروضہ یا موضوعہ نظم کی پابندی کے بغیر قرآن سے احکام و ہدایات کو درست طور پر اخذ کیا ہے۔

5۔ اِس غلطی کا محرک عصر حاضر کی بالادست اقوام کے علوم و افکار کی اثر پذیری ہے۔ غامدی صاحب کے تشریعی اطلاقات اور تفسیری نتائج سے اِس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مغربی اقوام کے خیالات، عادات اور طبائع سے ہم آہنگ ہیں۔ غامدی صاحب کے فکری مؤیدین کے عملی رجحانات سے بھی اِس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اِن مفردات کے تناظر میں فاضل متکلم کے کلام پر راقم کے تحفظات درج ذیل ہیں۔

---

[2]۔ موضوع سے متعلق دوسرے لیکچر میں فاضل متکلم نے اِس راے کو کچھ ملفوف کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اُس میں کسی نمایاں تغیر کی وضاحت نہیں کی۔ چنانچہ فی الحال یہی راے اُن کے موقف کی ترجمان سمجھنی چاہیے۔

اولاً، فاضل متکلم کے کلام سے یہ واضح نہیں ہے کہ اُنھوں نے اِسے کس نظام فکر میں کھڑے ہو کر ارشاد کیا ہے۔ فلسفے کے نظام فکر میں، تصوف کے نظام فکر میں، علم کلام کے نظام فکر میں، علم اللسان کے نظام فکر میں یا علوم اسلامی کے نظام فکر میں؟ اِس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہر نظام فکر مختلف مقدمات، جداگانہ طرزِ استدلال اور منفرد علم کلام کا حامل ہے۔ ایک کے اندر کھڑے ہو کر دوسرے کے بارے میں بحث و تمحیص مفیدِ مطلب نہیں ہو سکتی۔ اِس طرح نہ کوئی علمی مقدمہ قائم کیا جا سکتا، نہ بات کا ابلاغ ہوتا اور نہ صحت و خطا کا تعین ہو سکتا ہے۔ محض ایک عمومی خیال آرائی سامنے آتی ہے، جس کا مقام و مرتبہ خود کلامی سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ثانیاً، نظم قرآن کے باب میں غامدی صاحب کے موقف کو بیان کیے بغیر اُس پر تبصرے کا آغاز کیا گیا ہے۔ مثبت اندازِ تنقید اِس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ پہلے اُس موقف کو بے کم و کاست بیان کیا جائے، جس پر نقد مقصود ہے۔ اِس کے نتیجے میں یہ بات سب پر عیاں ہو جاتی ہے کہ جس نقطۂ نظر کو ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے، وہ ناقد پر پوری طرح واضح ہے یا وہ اُسے سمجھے بغیر دادِ تحقیق پیش کر رہا ہے۔

ثالثاً، غامدی صاحب کے تصورِ نظم پر نقد کا آغاز کرنے کے لیے درست مقام کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ اِس مقصد کے لیے ''میزان'' میں ''نظم کلام'' کے زیرِ عنوان لکھی گئی بحث کو منتخب کیا ہے۔ اِس بحث کو دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی الگ مضمون نہیں، بلکہ کتاب کے مقدمے ''مبادی تدبرِ قرآن'' کے دس نکات میں سے آٹھواں نکتہ ہے۔ سات نکات اِس سے پہلے ہیں۔ یہ سب باہم متصل اور مربوط ہیں اور خاص استدلالی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ اِن میں سے بعض ایسے بھی ہیں، جو نظم قرآن کی بحث میں اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِن سے صرفِ نظر کر کے نظم کلام کے نکتے سے نقد و جرح کا آغاز ابلاغِ نقد کے لیے کارگر نہیں ہو سکتا۔

تفہیم مدعا کے لیے اِس بات کی کچھ تفصیل عرض ہے۔ دیکھیے، ''مبادیِ تدبرِ قرآن'' کے اِن نکات میں سے پہلی چیز یہ بیانِ واقعہ ہے کہ قرآنِ مجید عرب کے قبیلۂ قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ گویا پروردگارِ عالم نے نہ وہ زبان اختیار فرمائی ہے، جس میں وہ مثال کے طور پر فرشتوں سے یا جنوں سے یا اجرام فلکی سے یا زمین و آسمان کی متنوع مخلوقات سے ہم کلام ہوتے ہیں اور نہ کسی

نئی زبان کو وجود بخشا ہے۔ اِس کے برعکس اُسی زبان کا انتخاب فرمایا ہے، جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے قبیلۂ قریش کی زبان تھی۔ یہ انسانوں کی زبان تھی، جو اُنھوں نے نطق کی فطری صلاحیت کی بنا پر صدیوں کے تعامل سے تشکیل دی تھی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کی بہم رسانی کے لیے وہی الفاظ، وہی اسالیب، وہی استعارے، وہی کنایے، وہی تشبیہات، وہی روز مرہ، وہی محاورے استعمال کیے، جو انسانوں کے وضع کردہ تھے اور قریش عرب میں ابلاغ مدعا کے لیے مستعمل تھے۔[3]

''مبادیِ تدبرِ قرآن'' میں دوسری چیز اِن نصوص کا بیان ہے کہ اللہ نے قرآن کو عربی مبین، یعنی واضح عربی زبان میں نازل فرمایا ہے اور اُس کے بیان کو ہر طرح کی کجی اور ہر قسم کے الجھاؤ سے پاک رکھا ہے۔ تیسری چیز یہ بیانِ واقعہ ہے کہ قرآن کا اسلوب نظم ونثر کے عام اسالیب سے مختلف ایک منفرد اسلوب ہے۔ چوتھی چیز یہ نصوص ہیں کہ قرآن کا متن حق و باطل کے لیے 'میزان' اور 'فرقان' اور تمام سلسلۂ وحی پر ایک 'مہیمن' کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی حق و باطل میں امتیاز کے لیے یہی کسوٹی اور معیار ہے۔ پانچویں چیز قرآن کی وہ تعریف ہے، جو خود اُس نے اپنے بارے میں کی ہے کہ وہ 'کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا' ہے۔ یعنی اُس کے مضامین اِس انداز سے بار بار سامنے آتے ہیں کہ ایک دوسرے کے لیے شرح و تفسیر کا کردار ادا کرتے ہیں۔ چھٹی چیز اِس واقعے کا بیان ہے کہ قرآن خدا کی آخری کتاب ہدایت ہے اور خدا ہی کی طرف سے ودیعت کیے گئے فطرت کے حقائق، دین ابراہیمی کے مراسم اور نبیوں کے صحائف اِس سے پہلے ہیں۔[4] ساتویں چیز یہ واقعہ ہے کہ قرآن اپنے مضمون کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگذشتِ انذار ہے۔

اِن سات چیزوں کے بعد نظم کلام کی بحث ہے، جس کا آغاز اِن الفاظ سے ہوا ہے:

''آٹھویں چیز یہ ہے کہ قرآن کی ہر سورہ کا ایک متعین نظم کلام ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الگ الگ اور متفرق ہدایات کا کوئی مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اُس کا ایک موضوع ہے اور اُس کی

---

[3]۔ تاہم جب اللہ تعالیٰ نے اُنھیں استعمال کیا تو اِس شان سے استعمال کیا کہ وہ انسانی کے بجاے الہامی کلام کی صورت اختیار کر کے فکر و نظر اور زبان وبیان کا عظیم معجزہ قرار پائے۔

[4]۔ اِن تینوں کا اثبات بھی قرآن کے متن سے ہوتا ہے۔

تمام آیتیں نہایت حکیمانہ ترتیب اور مناسبت کے ساتھ اُس موضوع سے متعلق ہوتی ہیں۔...''

(میزان 51)

رابعاً، اِس امر کا خیال نہیں کیا گیا کہ جس روایتی مذہبی فکر کا اعتبار کر کے تنقید، تغلیط اور تردید کی جا رہی ہے، اُس کا اپنا علمی طرزِ عمل کیا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ 'مقدم از قرآن' اور 'خارج از قرآن' کے جن دلائل کو غامدی صاحب کے فکر کی تردید کے لیے وضع کیا گیا ہے، وہ روایتی فکر کے تصورات کی تردید کے لیے بھی یکساں طور پر کارآمد ہو گئے ہیں۔ گویا جو سیفِ برہان تصورِ نظم قرآن کے لیے بے نیام کی گئی ہے، وہ علوم القرآن کے روایتی تصورات ـــ مکی و مدنی، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، وجوہ و نظائر، اعجاز القرآن اور تفسیر القرآن بالقرآن ـــ کے لیے بھی قاطع ہو گئی ہے۔[5]

بہر حال یہ سراسر الزام ہے کہ نظم قرآن کا اصول خارج سے مسلط کیا گیا ہے۔ ہرگز نہیں، یہ اُسی طرح قرآنِ مجید کے متن سے مستنبط ہے، جس طرح علوم القرآن کے مذکورہ بالا اصول قرآن کے کلام پر مبنی ہیں اور اُسی سے اخذ و استنباط کر کے مرتب کیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کتابِ الٰہی کا متن اپنے وجود سے شہادت دیتا ہے کہ وہ متفرق اجزا کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک منضبط اور منظم کلام کا شہ پارہ ہے۔

بر سبیل تنزل عرض ہے کہ اگر موقع ہو تو 'مقدم از قرآن' اور 'خارج از قرآن' کی بحث کے تناظر میں تفسیر بالماثور کے اصول کا بھی جائزہ لینا چاہیے اور بتانا چاہیے کہ اُس کا قرآن کے داخل سے کیا تعلق ہے؟

خامساً، تصورِ نظم قرآن کی تغلیط کے لیے بعض ایسے دلائل پیش کیے گئے ہیں، جو علمی لحاظ سے ناقابلِ اعتنا ہیں۔ اِس کی سب سے نمایاں مثال یہ استدلال ہے کہ کلام میں تعیین اور عمومی توضیح اور ابہام اور عمومی اخفا باہم لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی اگر کوئی چیز متعین ہے تو ضروری ہے کہ وہ سب کے لیے یکساں طور پر واضح ہو۔ اگر سب لوگ اُس سے یکساں وضاحت حاصل نہیں کر سکے تو اِس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ متعین نہیں، بلکہ مبہم ہے۔

اِس طرزِ استدلال کا مطلب یہ ہے کہ مثال کے طور پر ایک مشہود واقعے کو دیکھنے والے افراد

5۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرزِ استدلال سے نظم کلام کو قرآن سے مقدم اور خارج کہا گیا ہے، اُسی کی بنا پر یہ تصورات بھی قرآن سے مقدم اور خارج قرار پاتے ہیں۔

اگر اُس کے بیان میں اختلاف رکھتے ہیں تو اُس سے اُس کا وقوع لازماً غیر حتمی ہو جاتا ہے یا کسی گفتگو کو سننے والے اُسے نقل کرنے میں مختلف ہیں تو اِس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ اُس کا مفہوم غیر واضح ہے، اِسی طرح کسی کتاب کے قارئین یا شارحین اگر اُس کے مطالب پر متفق نہیں ہیں تو لازم ہے کہ وہ کتاب ابہامات کا مجموعہ ہو۔ اِن مثالوں میں استدلال کی غلطی یہ ہے کہ تعیین کا معیار یک طرفہ طور پر وصول کنندہ کو مان لیا گیا ہے اور خطا کو ارسال کنندہ پر منحصر کر دیا گیا ہے۔[6] یعنی شاہد، سامع اور قاری فیصلہ کن مقام پر فائز ہیں اور ابہام و اخفا یا نقص و خطا کی تمام ذمہ داری مشہود، متکلم اور مصنف پر عائد کر دی گئی ہے۔

واضح رہے کہ مدرسۂ فراہی کے علما کے نزدیک تعیین حقائق کے معاملے میں فیصلہ کن حیثیت دو چیزوں کو حاصل ہے:

ایک، مصدر،

دوسرے، شواہد و دلائل۔

وصول کنندگان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔

چنانچہ مصدر اگر اللہ کا کلام ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل ہے یا صحابۂ کرام کا اجماع ہے تو باقی تمام انسانوں کے مقابلے میں اِنھی کو معیار مانا جائے گا۔ اِن کی بات کے فہم میں اگر اختلاف ہو گا تو اُس میں صحت یا عدم صحت کا فیصلہ سامعین، قارئین یا شارحین کی اکثریت و اقلیت یا اُن کے اتفاق و اختلاف سے نہیں، بلکہ عقل و نقل کے دلائل سے کیا جائے گا۔

یہی موقف ہمارے اسلاف کا ہے۔ علم حدیث پر محدثین اور فقہا کے کام پر غور کیا جائے تو ہماری بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے۔

حدیث کی تعیین و عدم تعیین، رد و قبول اور تفہیم و تشریح میں اصل اور فیصلہ کن حیثیت اُس کے مصدر یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور من حیث المجموع آپ کے اقوال و افعال کو حاصل ہے۔ راویوں کے فہم، محدثین کی تحقیقات، شارحین کی تشریحات اور فقہا کے اطلاقات کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اِس معاملے میں اگر اختلاف ہو تو اُس کا فیصلہ عقل و نقل کے دلائل

---

[6]۔ دراں حالیکہ یہ عین ممکن ہے کہ تمام وصول کنندگان مجموعی طور پر غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں اور ارسال کنندہ بالکل درست ہو۔

سے کیا جاتا ہے، افراد کی قبولیت یا عدم قبولیت کو معیار نہیں بنایا جاتا۔ چنانچہ اِس علم کا معمول ہے کہ علما کی ایک جماعت کے معیارات پر پوری اترنے والی صحیح اور حسن کے درجے کی روایات کو کوئی صاحبِ علم بعض اوقات خلافِ قرآن ہونے کی بنا پر، بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متواتر عمل سے متصادم ہونے کی وجہ سے، بعض اوقات مخالفتِ عقل کی دلیل سے اور بعض اوقات استحالۂ عقلی کی بنیاد پر رد کر دیتا ہے۔[7] یہی معاملہ برعکس طور پر بھی ہے۔ یعنی کبھی سنداً ضعیف روایتوں کو عقلی شواہد و قرائن کی بنیاد پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے قبول کر لیا جاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تعیین صحت و قبولیت کی اساس دو ہی نکات پر مبنی ہے:

ایک: نسبت اور دوسرے: عقل و نقل کے دلائل۔

انسانوں کی اقلیت یا اکثریت یا اُن کے اختلاف و اتفاق یا اُن کے تفرد و اجماع کو یہ حیثیت ہرگز حاصل نہیں ہے۔

یہ جناب احمد جاوید صاحب کے مفردات پر راقم کے تحفظات کا خلاصہ ہے۔ اِن کے بیان سے مقصود اُن مخصصات اور ترددات کی نشان دہی ہے، جو اُن کی گفتگو سے ظاہر و باہر ہیں اور جن سے اعتنا برتے بغیر نظم کلام پر تنقید سعی لاحاصل کے مترادف ہے۔ هذا ما عندی والعلم عند الله۔

خاتمۂ کلام کے طور پر مناسب ہو گا کہ نظم قرآن کے زیر بحث موضوع پر بھی اپنے زاویۂ نظر سے چند نکات پیش کر دیے جائیں:

1۔ کلام الٰہی ابلاغِ معانی کے لیے نازل ہوا ہے اور ابلاغِ معانی نظم کلام کو لازم کرتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کا مخاطب ــــ انسان ــــ منظم کلام ہی کو سمجھ پاتا ہے۔ یعنی وہی کلام اُس کے فہم و ادراک تک رسائی حاصل کرتا ہے، جس کا واضح مضمون اور متعین مدعا ہو۔ جس کا کوئی پس منظر، کوئی سیاق و سباق، کوئی دروبست، کوئی آغاز اور کوئی اختتام ہو۔ اِن اجزا سے خالی مجموعۂ الفاظ اُس کے لیے ناقابلِ فہم ہوتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اُس میں نہ خطاب کا رخ متعین ہوتا ہے، نہ مخاطب کی تعیین ہوتی ہے، نہ محذوفات و مقدرات واضح ہوتے ہیں، نہ روزمرہ اور محاورے سمجھ میں آتے

---

[7]۔ رد کرنے کی گنجایش اِس لیے ہے کہ حدیث کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت یقینی نہیں، بلکہ ظنی ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید کی چونکہ آپ سے نسبت یقینی ہے، اِس لیے وہاں رد کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

ہیں، نہ لف و نشر کی ترتیب کا پتا چلتا ہے، نہ تلمیحات سے آگاہی ہوتی ہے، نہ تشبیہ و استعارے اور اشارے کنایے کے رموز کھلتے ہیں اور نہ اصل اور فرع، اصول اور اطلاق اور حقیقت اور مجاز میں فرق نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وہ انسانی ضرورت یا محدودیت ہے، جس کا لحاظ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ایک منظم و مرتب کلام ارشاد فرمایا ہے۔

2۔ کلامِ الٰہی کا مقصود فقط ابلاغِ معانی نہیں ہے، بلکہ اُس ابلاغ کو اتمام حجت کے مقام تک پہنچانا بھی ہے۔ یعنی اُسے اِس سطح پر انذار کرنا ہے کہ مخاطبین اگر اُس کے پیغام کا انکار کریں تو اُنھیں صفحۂ ہستی سے مٹا کر ابدی جہنم کا مستحق بنا دیا جائے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اُس کے الفاظ اُس کے مدعا پر پوری طرح واضح ہوں۔ وہ نہ صرف ایہام و ابہام اور تعلی و مبالغے جیسے اُن صنائع سے پاک ہو، جو شعر و ادب کا لازمی جز سمجھے جاتے ہیں، بلکہ اپنے بیان میں پوری طرح منظم و مرتب بھی ہو۔

3۔ اللہ نے قرآن کو محض عربی میں نہیں، بلکہ عربی مبین میں نازل فرمایا اور اُس کے بیان کو ہر طرح کی کجی اور ہر قسم کے الجھاؤ سے پاک رکھا ہے۔ ’نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ، عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ، بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِیْنٍ‘[8] اور ’قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ‘[9] کے نصوص اِسی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ یہ دونوں آیتیں نظم کلام کے مفہوم پر دال ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی غیر منظم کلام ’مبین‘ اور ’غیر ذی عوج‘ نہیں ہو سکتا۔ اُس میں خلا ہوں گے، فواصل ہوں گے، اخفا ہوں گے، اغلاق ہوں گے، الجھاؤ ہوں گے۔ اِن کی بہ دولت اُس کی نوعیت لاینحل چیستان کی ہو گی، جو مدعا کے ابلاغ سے قاصر ہو گا۔ سورۂ شعرا کی مذکورہ آیت کی وضاحت میں امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

> ”یہ اہل عرب پر اظہار احسان ہے کہ اللہ نے یہ تم پر خاص فضل فرمایا ہے کہ اُس نے اُس کلام کو نہایت واضح عربی زبان میں اتارا ہے۔ یہ چیز تمھارے لیے باعثِ شرف بھی ہے اور اِس

8۔ ”اِس کو تمھارے دل پر روح الامین لے کر اترا ہے، اِس لیے کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح تم بھی خبر دار کرنے والے بنو، نہایت صاف عربی زبان میں۔“ (الشعرا26: 93-95)

9۔ ”ایسے قرآن کی صورت میں جو عربی زبان میں ہے، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، اِس لیے کہ وہ خدا کے عذاب سے بچیں۔“ (الزمر39: 28)

میں تمھارے اوپر اتمام حجت بھی ہے۔ اب تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تم اِس کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ اِس اہتمام کے بعد بھی اگر تم نے اِس کی قدر نہ کی تو اِس کی ذمہ داری تمھارے ہی اوپر ہو گی۔'' (تدبر قرآن 5/ 558)

4۔ 'القرآن لا یحتمل إلا تأویلاً واحدًا'[10] کا اصول نظم کلام کا فطری نتیجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب نظم کی بہ دولت مدعا غیر مبہم ہو اور بات پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جائے تو ایک سے زیادہ تاویلات کا امکان سرے سے ختم ہو جاتا ہے اور قاری کے لیے کلام الٰہی کی دلالت اُس کے مفہوم پر قطعی ہو جاتی ہے۔

اِس پر بادی النظر میں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر قرآن تاویل واحد پر مبنی ہے تو پھر مفسرین میں اختلاف کیوں پایا جاتا ہے؟ اِس اعتراض میں جہاں تک اِس مفروضے کا تعلق ہے کہ اختلاف قطعیت کو ختم کرتا اور ظنیت کو لازم کرتا ہے، تو اِس کا محاکمہ سطورِ بالا میں ہو چکا ہے۔ تاہم، اِس کے باوجود چند مقدر سوالوں کا جواب ضروری ہے:[11]

ایک سوال یہ ہے کہ اگر کوئی مفسر نظم کلام کی رو سے کسی آیت کی واحد تاویل کرتا ہے تو کیا اُس تاویل کا کلام الٰہی کے مدعا کے عین مطابق ہونا لازم ہے؟

اِس کا جواب نفی میں ہے۔

عین ممکن ہے کہ وہ منشاے الٰہی کے مطابق ہو اور عین ممکن ہے کہ اُس سے غیر مطابق ہو۔ اِس کا صحیح علم قبل از قیامت ممکن نہیں ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر تاویل کی صحت یا عدم صحت کا علم قیامت تک موقوف ہے تو پھر اُسے قطعی کیوں کہا جاتا ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ اِس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ تاویل جانبین کے لیے قطعی کے درجے میں ہوتی ہے۔ متکلم ــــ اللہ تعالیٰ ــــ کے لیے تو بلاشبہ قطعی ہے، مگر مخاطب ــــ انسان ــــ کے لیے بھی اِس بنا پر قطعی ہوتی ہے کہ وہ اُسے بلاتردد اپنے پروردگار کا منشا سمجھ رہا ہوتا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ ایک مفسر کی تاویل واحد کیا دوسرے افراد کے لیے بھی قطعی کا درجہ

---

[10]۔ ''قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔'' (رسائل الامام الفراہی 230)۔

[11]۔ اِس کی ضرورت جناب احمد جاوید صاحب کے نقد کی دوسری قسط سے نمایاں ہوتی ہے۔

رکھتی اور اِس بنا پر اُن کے لیے حجت قرار پاتی ہے؟

اِس کا جواب نفی میں ہے۔ ہر عالم و عامی اُسی بات کا مکلف ہے، جسے وہ اپنے علم و فہم کے مطابق خدا کی بات کے طور پر قبول کرتا ہے۔ دوسرے کے علم و تحقیق کو قبول کرنا لازم نہیں ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ اگر قطعیت کا دائرہ فردِ واحد ہی تک محدود ہے تو پھر اُسے ظنیت سے کیوں تعبیر نہیں کر دیا جاتا؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ ایسا اِس لیے نہیں کیا جاتا، کیونکہ اِس کے نتیجے میں اولاً، متکلم ــــ اللہ تعالیٰ ــــ کے کلام پر ظنیت کا الزام آتا ہے، جو بالبداہت باطل ہے اور ثانیاً، مخاطب کے لیے دین کے علم و عمل کو شعوری طور پر اختیار کرنا ممکن نہیں رہتا۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ تاویل واحد اور قطعیت اور ظنیت کے اِس تصور کی تفہیم کے لیے کیا قرآنِ مجید سے کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

اِس کا جواب اثبات میں ہے۔

شریعت کے مطابق رمضان کی راتوں میں بیویوں کے پاس جانا جائز ہے۔ زمانۂ رسالت میں بعض مسلمان اِس اجازت سے لاعلم تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس سے منع فرمایا ہے۔ یعنی وہ اِس معاملے میں شریعت کی غلط تاویل پر قائم تھے۔ اُن میں سے بعض لوگوں نے جب بیویوں سے رجوع کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس اقدام کو اپنے آپ کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا اور اپنی جناب میں خطا قرار دیا۔

اِس مثال سے واضح ہے کہ اللہ کا قطعی حکم 'جواز' کا تھا، جب کہ لوگ 'عدم جواز' کو اللہ کا قطعی حکم سمجھ رہے تھے۔ یعنی قلتِ علم کے باعث تاویل کی غلطی کا شکار تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ نے کس قطعیت کا اعتبار کیا؟ خدائی قطعیت کا یا انسانی قطعیت کا؟ جواب یہ ہے کہ قرآن سے واضح ہے کہ اللہ نے انسانی قطعیت کا اعتبار کیا۔ یعنی اُن کی غلط تاویل کو اِس لیے خیانت قرار دیا کہ وہ اُن کے نزدیک صحیح تاویل تھی۔

اِس مثال سے واضح ہے کہ جب انسانی سطح پر قطعی کا لفظ بولا جاتا ہے تو وہ خدائی سطح پر ابدی قطعیت کو لازم نہیں کرتا۔ اِس قطعیت کا تعلق انسان کے حدودِ علم و ادراک سے ہوتا ہے اور یہ

انسان کے اجتماعی شعور پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ شعور قطعیت کے حق میں دلائل فراہم کرتا ہے اور انسانوں کے مابین صحیح اور غلط کے امتیاز کو مبرہن کرتا ہے۔ یہی انسانی قطعیت ہے، جس پر دنیا کا نظام قائم ہے اور یہی انسانی قطعیت ہے، جو بارگاہِ خداوندی میں علم و عمل کا معیار ہے۔

محمد حسن الیاس

انسان کو آزمایش میں کیوں ڈالا گیا؟

یہ دنیا آزمایش کے اصول پر بنائی گئی ہے۔ اِس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اِس کے جز جز میں تنوع کا اہتمام کیا ہے اور پھر اُس تنوع میں عظیم الشان ہم آہنگی کو وجود بخشا ہے۔ ہر چیز ایک دوسرے سے مختلف ہے، مگر موافقت کے گونا گوں پہلو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ پوری کائنات اختلاف میں اتفاق اور اتفاق میں اختلاف کی معجزہ آرائی ہے۔ چنانچہ جب ہم اپنے خارج پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ کائنات اختلافات کی رنگارنگی اور تنوعات کے عجائبات کا نگارخانہ ہے۔ اس کا اختلاف حسن و جمال شاہ کار ہے۔ اس کا افتراق نظم و ترتیب کا معجزہ ہے۔ یہ اختلاف و افتراق صرف کائنات ہی کا عنوان نہیں، بلکہ وجود انسانی کا بھی سرنامہ ہے۔ ہمارا چہرہ مہرہ، رنگ روپ دوسروں سے مختلف ہے۔ آواز و آہنگ، چال ڈھال، وضع قطع میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اِس ظاہری رنگارنگی کے ساتھ داخل میں بھی تفاوت کی ایک دنیا آباد ہے۔ اذواق و رجحانات، عادات و اطوار، مزاج و طبائع میں بھی نوع بہ نوع امتیازات اظہر من الشمس ہیں۔ یہ سب آزمایش کے اسباب و وسائل ہیں۔ آزمایش یہ ہے کہ ہر شخص کو علم و عمل میں پاکیزہ رہنے کا امتحان درپیش ہے۔ اس امتحان کا نتیجہ آخرت میں نکلنا ہے اور دنیا کی کارکردگی کے موافق جزا اور سزا ملنی ہے۔

یہ مذہب کا مقدمہ ہے۔ اِس پر ہر ذی شعور کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کارکردگی پر آخرت میں انسان نے جزا و سزا پانی ہے، اس کے مواقع اس دنیا میں سب کے لیے یکساں کیوں

نہیں ہیں؟ آزمایش اگر علم و عمل کا امتحان ہے تو علم اور عمل، دونوں کے معاملے میں سب انسانوں کو یکساں صلاحیتیں، یکساں حالات اور یکساں مواقع کیوں نہیں دیے گئے؟ اس پر مستزاد یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے بعض انسانوں کو نبوت کے منصب پر فائز کر کے ایک طرف ان پر لامکاں کے علوم کی راہیں کھول دی ہیں اور دوسری طرف ان کی شیاطین سے حفاظت فرما کر اُن کے عمل کو محفوظ کر دیا ہے۔

علم و عمل پر جزا و سزا کی اس خدائی اسکیم پر جب اہل خرد نظر ڈالتے ہیں تو وہ مذہب بیزاری کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب اہل طریقت کو یہ مسئلہ پیش آتا ہے تو مراتب کے حصول کی متبادل دنیائیں تشکیل دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس اضطراب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اہل عقل کائنات کو خدا کے منصب پر فائز کر دیتے ہیں اور اُس کے انداز و اطوار کو اُس میں رونما ہونے والے اتفاقات کی کرشمہ سازی قرار دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اہل طریقت کمالاتِ نبوت کو ہدف بناتے ہیں اور مخاطبۂ الٰہی کے شوق میں مشقوں، چلوں اور ریاضتوں کے ذریعے سے ماورائے افلاک جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس اضطراب کا جواب ہمارے اہل مذہب کی جانب سے یہ دیا جاتا ہے کہ بے شک انسانوں کے لیے کارکردگی کے مواقع مختلف ہیں، مگر اصول یہ ہے کہ جس کی آزمایش سخت ہے، اس کا انعام بھی زیادہ ہے اور جس کی آزمایش کم ہے، اس کی جزا بھی کم ہے۔ اس کی سادہ مثال یہ دی جاتی ہے کہ پیغمبر کی موجودگی کی وجہ سے اس کے نہ ماننے کی سزا اگر سخت ہے، تو ماننے کے نتیجے میں صحابی کا مرتبہ بھی تو ملتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ دیگر زمانے کے لوگوں کو یہ موقع کیوں نہیں فراہم کیا کہ وہ بڑے انعام کے حصول کے لیے بڑا خطرہ مول لیتے؟ تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دنیا میں مواقع کی تقسیم اور پھر اس حساب سے جزا اور سزا کا حصول انسان کا خود اختیار کردہ ہے، لہٰذا انسان کو اس پر اعتراض کا حق نہیں۔ انسانوں نے خود اپنے لیے یہ امتحان کے مواقع تجویز کیے ہیں اور یہ بات قرآن اس طرح واضح کرتا ہے کہ انسان نے خود آگے بڑھ کر اس امانت کا بوجھ اٹھایا، بلکہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ہر انسان اس وقت انفرادی طور پر موجود تھا، اس لیے بظاہر اس بات میں کوئی مانع نہیں کہ ہر انسان کو یہ اختیار بھی دیا جاتا کہ وہ آزمایش کا درجہ بھی خود چن لے۔

ہمارے نزدیک یہ جواب تسلی بخش نہیں ہے۔ اللہ کی کتاب سے رجوع کیا جائے تو یہ جواب ملتا ہے کہ زمین کا سب ساز و سامان اِسی امتحان کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔ استاذِ محترم جناب جاوید احمد غامدی کے الفاظ میں ''یہ وسیلۂ امتحان ہے جس کے درمیان انسان کو رکھ کر اللہ تعالیٰ یہ دیکھ رہا ہے کہ اِس کے ذریعے سے وہ اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرتا اور اِس طرح آخرت کی فوز و فلاح سے ہم کنار ہوتا ہے یا اِس کی دل فریبیوں میں گم ہو کر اپنی راہ کھوٹی کر لیتا ہے۔''[12]

سورۂ کہف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَۃً لَّھَا لِنَبْلُوَھُمْ اَیُّھُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا. (7:18)	''زمین پر جو کچھ ہے، اُس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے، اِس لیے کہ ہم لوگوں کا امتحان کریں کہ اُن میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی اِس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''... فرمایا کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اس میں ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کون اپنی عقل و تمیز سے کام لے کر آخرت کا طالب بنتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ کر اسی دنیا کا پرستار بن کر رہ جاتا ہے۔ اس امتحان کے تقاضے سے ہم نے اس دنیا کے چہرے پر حسن و زیبائی کا ایک پر فریب غازہ مل دیا ہے۔ اس کے مال و اولاد، اس کے کھیتوں کھلیانوں، اس کے باغوں اور چمنوں، اس کی کاروں اور کوٹھیوں، اس کے محلوں اور ایوانوں، اس کی صدارتوں اور وزارتوں میں بڑی کشش اور دل فریبی ہے۔ اس کی لذتیں نقد اور عاجل اور اس کی تلخیاں پس پردہ ہیں۔ اس کے مقابل میں آخرت کی تمام کامرانیاں نسیہ ہیں اور اس کے طالبوں کو اس کی خاطر بے شمار جانکاہ مصیبتیں نقد نقد اسی دنیا میں جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہ امتحان ایک سخت امتحان ہے۔ اس میں پورا اترنا ہر بوالہوس کا کام نہیں ہے۔ اس میں پورے وہی اتریں گے جن کی بصیرت اتنی گہری ہو کہ خواہ یہ دنیا ان کے سامنے کتنی ہی عشوہ گری کرے، لیکن وہ اس عجوزۂ ہزار داماد کو اس کے ہر بھیس میں تاڑ جائیں اور کبھی اس کے عشق میں پھنس کر آخرت کے ابدی انعام کو قربان کرنے

---

[12] ۔ میزان 114۔

پر تیار نہ ہوں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنی عقل و دل کی آنکھیں اندھی کر لی ہیں اور اپنی خواہشوں کے پرستار بن کے رہ گئے ہیں وہ اس نقد کو آخرت کے نسیہ کے لیے قربان کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے اگرچہ اس کے حق ہونے پر اس کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے۔“

(تدبر قرآن 4/558)

روشنی کی جستجو ہوتی ہے جب ظلمات میں
دیکھ لیتے ہیں کلام اللہ کے آیات میں

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(2)

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ

(اِن کے پیچھے لگ کر تم اپنے آپ کو برباد کیوں کرتے ہو)؟ تم اپنے اُس پروردگار کی بندگی کرو، لوگو، جس نے تمھیں پیدا کیا ہے اور تم سے پہلوں کو بھی، اِس لیے کہ تم (اُس کے عذاب سے) بچے رہو۔ (وہی) جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور آسمان سے پانی اتارا ہے، پھر اُس سے تمھاری روزی کے لیے طرح طرح کے میوے پیدا کر دیے ہیں۔ لہٰذا تم اللہ کے ہم سر نہ ٹھیراؤ، دراں حالیکہ تم اِن سب باتوں کو جانتے ہو۔ 22-21

(یہی اِس کتاب کی دعوت ہے، اِسے قبول کرو)، اور جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے،

مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا ۙ قَالُوۡا هٰذَا الَّذِىۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمۡ فِيۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵﴾

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسۡتَحۡىٖۤ اَنۡ يَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَةً فَمَا فَوۡقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فَيَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَيَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا ۙ وَّيَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ ۠ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾

كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَكُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡيَاكُمۡ ۚ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡكُمۡ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَـكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۚ ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰٮهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۹﴾

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـئُوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۱﴾

اُس کے بارے میں اگر تمھیں شبہ ہے تو (جاؤ اور) اِس کے مانند ایک سورہ ہی بنالاؤ اور (اِس کے لیے) خدا کے سوا تمھارے جو زعما ہیں، اُنھیں بھی بلالو، اگر تم (اپنے اِس گمان میں) سچے ہو۔ پھر اگر نہ کر سکو اور ہر گز نہ کر سکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن وہ لوگ بھی ہوں گے جو نہیں مانتے اور اُن کے وہ پتھر بھی جنھیں وہ پوجتے ہیں۔ وہ اِنھی منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور اُن کو جو (اِس کتاب پر) ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، اِس بات کی بشارت دو، (اے پیغمبر) کہ اُن کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اُن کا کوئی پھل اُنھیں جب بھی کھانے کے لیے دیا جائے گا تو کہیں گے: یہ وہی ہے جو اِس سے پہلے ہمیں دیا گیا، دراں حالیکہ اُن کو یہ اُس سے ملتا جلتا دیا جائے گا، اور اُن کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ 25-23

(یہ جنت کی تمثیل ہے، اور) اللہ اِس بات سے نہیں شرماتا کہ (کسی حقیقت کی وضاحت کے لیے) وہ مچھر یا اِس سے بھی حقیر کسی چیز کی تمثیل بیان کرے۔ پھر جو ماننے والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ اُن کے پروردگار کی طرف سے حق آیا ہے، اور جو نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ اِس مثال سے اللہ

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

نے کیا چاہا؟ (اِس طرح) اللہ بہتوں کو اِس سے گم راہ کرتا اور بہتوں کو اِس سے راہ دکھاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اِس سے گم راہ تو سرکشوں ہی کو کرتا ہے۔ جو اللہ کے عہد کو اُس کے باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُسے کاٹتے ہیں، اور اِس طرح زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی ہیں جو (دنیا اور آخرت، دونوں میں) نامراد ہیں۔ 27-26

(لوگو)، تم اللہ کے منکر کس طرح ہوتے ہو، دراں حالیکہ تم مردہ تھے تو اُس نے تمھیں زندگی عطا فرمائی؟ پھر وہی تم کو مارتا ہے، پھر وہی زندہ کرے گا، پھر تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہی جس نے تمھارے لیے زمین کی سب چیزیں پیدا کیں، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور سات آسمان استوار کر دیے، اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ 29-28

(اِن سے پوچھو، اے پیغمبر کہ یہ منکر کس طرح ہوتے ہیں)؟ اور (اِس دنیا کے بارے میں ہماری اسکیم کو سمجھنے کے لیے) وہ واقعہ اِنھیں سناؤ، جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک ایسی مخلوق بنانے والا ہوں جسے (اُس کی) بادشاہی دی جائے گی۔ اُنھوں نے عرض کیا: کیا آپ اُس میں وہ مخلوق بنائیں گے جو وہاں فساد کرے گی اور خون بہائے گی، اور اِدھر ہمارا معاملہ یہ ہے کہ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ ہم آپ کی تسبیح و تقدیس کر رہے ہیں؟ فرمایا: میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور (اُنھیں سمجھانے کے لیے) آدم کو سب نام سکھا دیے۔ پھر (جن کے نام سکھائے)، اُن ہستیوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ پھر فرمایا: مجھے اِن لوگوں کے نام بتاؤ، اگر تم (اپنے اِس خیال میں) سچے ہو۔ اُنھوں نے عرض کیا: آپ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے، ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا آپ نے ہمیں بتایا ہے، علیم و حکیم تو اصل میں آپ ہی ہیں۔ فرمایا: آدم، تم اِن ہستیوں کے نام اِنھیں بتاؤ۔ پھر جب اُس نے اُن کا تعارف اُنھیں کرا دیا تو فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم چھپا رہے تھے۔ 33-30

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور (ہماری اِس اسکیم میں انسان کے امتحان کو سمجھنے کے لیے) وہ واقعہ بھی اِنھیں سناؤ، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ سب سجدہ ریز ہو گئے، ابلیس کے سوا۔ اُس نے انکار کر دیا اور اکڑ بیٹھا اور اِس طرح منکروں میں شامل ہوا۔ اور ہم نے کہا: اے آدم، تم اور تمھاری بیوی، دونوں اِس باغ میں رہو اور اِس میں سے جہاں سے چاہو، فراغت کے ساتھ کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اِس درخت کے پاس نہ جانا، ورنہ ظالم ٹھیرو گے۔ پھر شیطان نے اُن کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس حالت میں وہ تھے، اُس سے اُنھیں نکلوا کر چھوڑا۔ اور ہم نے کہا: (یہاں سے) اتر جاؤ، اب تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھیرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) چند الفاظ سیکھ لیے (اور اُن کے ذریعے سے توبہ کی) تو اُس پر اُس نے عنایت فرمائی اور اُس کو معاف کر دیا۔ بے شک، وہی بڑا معاف فرمانے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ہم نے کہا: تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر میری طرف سے اگر کوئی ہدایت تمھارے پاس آئے تو اُسی پر چلنا، اِس لیے کہ جو لوگ میری اِس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کا صلہ جنت ہے، سو اُن کے لیے نہ وہاں کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کبھی غم زدہ ہوں گے۔ اور جنھوں نے (اِس کا) انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا، وہ دوزخ کے لوگ ہیں، وہ ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔ 34-39

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

ابو حوراء سعدی کہتے ہیں: میں نے حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ باتیں یاد ہیں؟ انھوں نے فرمایا: ایک مرتبہ آپ مجھے اُس کمرے میں لے گئے، جہاں صدقے کا مال پڑا ہوتا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے صدقے کی ایک کھجور وہاں سے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس پر لگے ہوئے تھوک سمیت اُسے باہر نکالا اور دوسری کھجوروں میں ڈال دیا۔ ایک شخص نے یہ دیکھا تو کہا: اگر یہ ایک کھجور کھا لیتے تو کیا ہو جاتا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم صدقے کا مال نہیں کھاتے۔ سیدنا حسن کا بیان ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: اُن چیزوں کو چھوڑ کر جو شک پیدا کرتی ہیں، بے شبہ چیزیں اختیار کیا کرو، اِس لیے کہ سچائی اطمینان اور جھوٹ سراسر تردد اور خلجان ہے۔ (مسند احمد، رقم 1723)

— 2 —

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ غرور و تکبر خیمے والوں میں ہے جو چلّا کر بولتے ہیں اور وقار و اطمینان بھیڑ بکری والوں میں ہے۔ (مسلم، رقم 80)

— 3 —

حضرت ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عزت پروردگار کی ازار اور بزرگی اُس کی ردا ہے۔ اللہ فرماتا ہے: جو شخص اِن چیزوں کو مجھ سے لینے کے لیے جھگڑے گا، میں اُس کو عذاب دوں گا۔ (مسلم، رقم 4758)

مقامات

جاوید احمد غامدی

قافلہ در قافلہ

میں نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھولی، وہ اسلامی انقلاب کے لیے قائم ہونے والے اداروں اور تنظیموں کا دور تھا۔ انسان اپنے گردوپیش سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ کالج کے زمانے میں ہم چند دوستوں نے بھی "دائرۃ الفکر" کے نام سے ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُن میں یار عزیز ڈاکٹر ساجد علی سب سے نمایاں تھے۔ وہ اِس وقت پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے سربراہ ہیں۔ لنک میکلوڈ روڈ پر میرے پاس کرایے کا ایک کمرا تھا۔ ماہنامہ "خیال" کے نام سے میں وہاں سے ایک رسالہ شائع کرنا چاہتا تھا۔ اِس ادارے کی ابتدا اِسی کمرے سے ہوئی۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی انقلاب کے لیے ایک تحریک برپا کی جائے جس میں یہ ادارہ ایک علمی مرکز اور مرکز قیادت کی حیثیت سے کام کرے۔ اِس کے بعد ایک دارالعلوم قائم کرنے کا ارادہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ اِس دارالعلوم سے جو لوگ پڑھ کر نکلیں، آیندہ کے لیے تحریک کی قیادت اُنھی میں سے منتخب کی جائے۔ یہ ایک رومانوی تصور تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی جماعت میں جو خامی رہ گئی ہے، وہ اِسی طرح دور کی جاسکتی ہے۔ دو تین ماہ تک ہم لنک میکلوڈ روڈ کے اِس کمرے میں ملتے اور پڑھتے پڑھاتے رہے، لیکن اندازہ ہوا کہ پیش نظر مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اکٹھے گزارنا ضروری ہے۔ چنانچہ اُن دوستوں نے، جو ہاسٹل میں رہتے تھے،

فیصلہ کیا کہ وہ ہاسٹل چھوڑ دیں گے اور اپنا سب جیب خرچ اور ہاسٹل کے اخراجات کے لیے ملنے والی رقم ملا کر ایک مکان کرایے پر لیں گے، جہاں اِس تحریک کا مرکز قائم کیا جائے گا۔ میرا گھر اُس زمانے میں لاہور ریلوے اسٹیشن کے پاس محلہ سلطان پورہ میں تھا۔ تلاش شروع ہوئی تو ایک مکان قریب ہی مل گیا اور یہ سب دوست وہاں منتقل ہو گئے۔

ہم جو دارالعلوم قائم کرنا چاہتے تھے، اُس کا نام ہم نے ''جامعہ الحمرا'' تجویز کیا تھا۔ اِس کی رعایت سے ''الحمرا'' کے نام سے ایک مجلہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ دوستوں کے مشورے سے طے ہوا کہ اِس کے لیے کتابت کے بجاے ٹائپ پر چھاپنے کا طریقہ اختیار کیا جائے، جس میں حروف جوڑ کر عبارت تیار کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کو اِس طریقۂ طباعت کا تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ اِس میں پروف کی غلطیاں بہت ہوتی تھیں جنھیں دقت نظر سے درست کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے ساتھ حادثہ یہ ہوا کہ پروف دیکھ کر ہم پریس والوں کے حوالے کر آئے اور مطمئن ہو گئے کہ غلطیوں کی تصحیح ہو جائے گی۔ مگر مجلہ چھپ کر آیا تو معلوم ہوا کہ جن غلطیوں کی نشان دہی کی گئی تھی، اُن میں سے کوئی غلطی بھی درست نہیں ہوئی۔ اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اُسے ضائع کر دیا جائے۔ یہ پہلا حادثہ تھا جس سے اپنی ناتجربہ کاری کے باعث دوچار ہونا پڑا۔ ابھی اِس کی پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور افتاد آ پڑی۔ چند ہی مہینوں کے بعد ہمیں وہ مکان خالی کرنا پڑا جس میں اپنی تحریک کا ایک مرکز ہم نے قائم کر لیا تھا۔ نیا مکان کئی مہینوں کی تگ و دو سے ملا۔ یہ ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک میں 29 نمبر مکان تھا۔ ہم نے خدا کا شکر کیا کہ تعطل کا زمانہ زیادہ طویل نہیں ہوا اور کام ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا ہے۔ 1971ء کے جون میں ہماری ملاقات لاہور کے ایک ایڈووکیٹ چودھری محمد انور صاحب سے ہوئی۔ اُن کے ایک بزرگ دوست سید بدر بخاری بھی اِس ملاقات کے موقع پر موجود تھے۔ یہ دونوں ہمارے پروگرام سے بہت متاثر ہوئے۔ اُن کی تجویز تھی کہ اِس کام کو آگے بڑھانے کے لیے علامہ اقبال روڈ پر اُن کے محلے میں درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا جائے۔ 7 جولائی کو یہ حلقہ قائم ہوا اور اِس کے نتیجے میں ہم طالب علموں کو چند بڑوں کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ اِن میں سید ارشد بخاری اور شیخ محمد ارشد سب سے نمایاں تھے۔ یہ دونوں دوست تھے اور واپڈا میں ملازمت کرتے تھے۔ اِس سے پہلے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درسوں میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اِن دونوں کو

''ارشدین'' کہا کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو برس تک درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اب کافی لوگ ہمارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ لہٰذا سید بدر بخاری کی امارت میں تحریک کا باقاعدہ نظم قائم کر دیا گیا۔ اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدنی ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ وہ بھی اُس میں شامل ہو گئے۔ درس کے بعض دوسرے شرکا نے بھی اُس میں شمولیت اختیار کر لی۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ بدر بخاری صاحب عمر کے اُس حصے میں تھے کہ اِس طرح کے کسی نظم کی قیادت اُن کے لیے آسان نہ تھی۔ لہٰذا چند مہینوں کے اندر ہی باہمی مشورے سے یہ تنظیم ختم کر دی گئی۔

مارچ 1973 میں ہم نے ''دائرۃ الفکر'' سے ایک مجلہ ''اشراق'' کے نام سے چھاپا۔ ہمارا خیال تھا کہ ڈیکلریشن مل جائے گا تو اِسے ایک باقاعدہ رسالے کی صورت دے دیں گے اور اِس کے ذریعے سے اپنی بات لوگوں تک پہنچائیں گے، لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ ڈیکلریشن ملنا آسان نہیں ہے، اِس لیے یہ اسکیم روبہ عمل نہ ہو سکی۔ اِس کے چند ماہ بعد ہمارے مالک مکان نے کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کر دیا۔ اُس وقت کے حالات میں ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ اُس کا مطالبہ پورا کرتے، اِس لیے ماڈل ٹاؤن کا یہ مکان بھی چھوڑنا پڑا۔ اِس کے بعد کئی مہینے تک ہم لوگ منتشر رہے۔ ادارہ بھی معطل رہا۔ خدا خدا کر کے گارڈن ٹاؤن کے احمد بلاک میں ایک مکان ملا۔ دوست جمع ہوئے، سازو سامان درست کیا گیا اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ ہمارے بعض دوستوں کو ''دائرۃ الفکر'' کا نام پسند نہیں تھا۔ چنانچہ اِس کی جگہ ادارے کے لیے ''دار الاشراق'' کا نام اختیار کیا گیا۔ ابتدا میں جو طالب علم اِس سے متعلق ہوئے تھے، اُن میں سے میں اور ساجد علی ہی باقی تھے۔ شیخ افضال احمد، مستنصر میر، چودھری الیاس احمد اور چودھری محمد رفیق نئے رفقا تھے۔ ہمارے دوست ذوالفقار احمد خاں بھی اِسی دور کی یادگار ہیں۔ وہ ہمارے قریب ہی رہتے تھے، اور اگرچہ ادارے سے متعلق نہیں تھے، مگر اُسی کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے۔ یہی معاملہ اصغر نیازی اور محمد طارق میکن کا بھی تھا۔ یہ دونوں دوستانہ تعلق سے ہمارے پاس مقیم تھے۔

اُس زمانے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک روز ملاقات کے لیے گیا تو اِس کام کا بھی ذکر ہوا۔ مولانا نے تفصیلات پوچھیں، رفقا سے تعارف حاصل کیا، میں نے اپنی مشکلات بتائیں، وہ موانع بیان کیے جو کام میں تعطل کا باعث

بن جاتے تھے اور اُن سے سرپرستی کی درخواست کی۔ مولانا نے میری یہ درخواست ازراہ عنایت قبول فرمالی۔ چنانچہ اُن کی ہدایت کے مطابق ادارے کے لیے میرے اور مولانا کے نام سے ایک مشترک اکاؤنٹ اچھرہ کے حبیب بنک میں کھولا گیا جس میں مولانا نے اپنی جیب سے ماہانہ ایک ہزار روپے جمع کرانے شروع کر دیے۔ احمد بلاک سے ہم لوگ مولانا کے گھر کے پاس اُنھی کی دی ہوئی ایک عمارت 1۔اے ذیلدار پارک اچھرہ میں منتقل ہو گئے۔ مولانا کا خیال تھا کہ اِسے ''ادارۂ معارف اسلامی'' کی ایک شاخ یا ایک نئے ادارے کی حیثیت سے منظم کیا جائے گا۔ اِس سے پہلے مولانا ہی کے ایما سے میں ''جماعت اسلامی'' کا رکن بن چکا تھا، لیکن مولانا کا یہ فیصلہ جماعت کے بعض بزرگوں کو پسند نہیں آیا۔ چنانچہ ایک مہم شروع ہوئی اور سات آٹھ مہینے کے بعد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ اِن حالات میں یہاں رہ کر کام کرنا ممکن نہ ہو گا۔ جماعت کی یہ خواہش بھی اسلم سلیمی صاحب نے مجھ تک پہنچادی تھی کہ ادارہ جس عمارت میں قائم ہے، اُسے وہ الیکشن کا دفتر بنانا چاہتی ہے۔ یہ صورت حال بتا رہی تھی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ لہٰذا ہم نے مشورہ کیا، مولانا سے اجازت چاہی اور چودھری الیاس احمد کی دعوت پر لاہور کے قریب ہی واقع اُن کے گاؤں مرید کے منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ 1976ء کے آخر میں ہم یہاں پہنچے اور 11 جنوری 1977 کو جماعت اسلامی پنجاب کے امیر مولانا فتح محمد صاحب کا ایک خط موصول ہوا جس میں اُنھوں نے مطلع کیا تھا کہ جماعت سے میری رکنیت ختم کر دی گئی ہے۔ یہ ایک دو سطروں کی تحریر تھی جس میں بغیر کوئی وجہ بتائے فیصلہ سنا دیا گیا تھا کہ میں اب جماعت کا رکن نہیں رہا۔ میاں طفیل محمد صاحب اُس زمانے میں جماعت اسلامی پاکستان کے امیر تھے۔ میں نے اُن کے نام خط لکھا اور اِس فیصلے کے وجوہ معلوم کرنا چاہے، مگر اِس کا کوئی جواب مجھے کبھی نہیں دیا گیا۔

یہ وصل و فصل میرے لیے زندگی کا ایک اہم تجربہ تھا۔ میں نے اِس عرصے میں اپنے عہد کی ایک عظمت کو بہت قریب سے دیکھا، اُن کے ساتھ کھڑے ہو کر نمازیں پڑھیں، اُن سے باتیں کیں، زندگی کے آداب سیکھے، صبر و حکمت کا درس لیا، زبان و بیان کی بعض نزاکتیں سمجھیں، ماچھی گوٹ سے پہلے اور بعد میں جو کچھ ہوا، اُس کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر خود اُن کی زبان سے سنا، مولانا اصلاحی کے ساتھ اُن کے علمی اختلافات پر اُن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ امام فراہی کے متعلق اُن کے عقیدت مندانہ تاثرات سنے، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور علامہ اقبال سے اُن کی محبت

کی داستان سنی۔ یہ صحبتیں سرمایۂ حیات ہیں اور میں اب بھی مولانا کو اُسی طرح یاد کرتا ہوں، جس طرح ایک مہجور بیٹا اپنے باپ کو یاد کرتا ہے۔ اُن کی جماعت کو بھی میں اپنی برادری سمجھتا ہوں اور پالیسی اور طرز عمل سے ہزار اختلافات کے باوجود ایسا ہی تعلق خاطر محسوس کرتا ہوں، جس طرح کوئی شخص اپنے خاندان سے محسوس کرتا ہے۔ میرے خلاف مہم میں جو لوگ پیش پیش رہے، وہ شاید مجھے نہیں جانتے تھے، اِس لیے اُن سے بھی کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں اُن سے حسن ظن رکھتا ہوں کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا، اپنی دانست میں جماعت کی بہتری کے لیے کیا۔ مولانا نے امریکہ جانے سے پہلے آخری ملاقات میں مجھ سے کہا تھا: میری عزیز توقعات آپ سے وابستہ ہیں۔ اپنے ناقدین کی بات ہمیشہ توجہ کے ساتھ سنیے، پستی پر اتر آئیں تو 'اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا' کا طریقہ اختیار کیجیے، وہ آپ کو مشتعل کرنا چاہیں تو اُن کے افترا اور بہتان طرازی کے باوجود اشتعال میں آنے سے انکار کر دیجیے، اِس کے بعد خدا آپ کے ساتھ ہو گا اور آپ ان شاء اللہ اُنھیں اپنے میدان میں شکست دیں گے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں مولانا کی یہ نصیحت ہمیشہ میرے پیش نظر رہی ہے۔ یہ اِسی کا اثر ہے کہ:

اِس دشت بے چراغ میں کرتا ہوں روز و شب
پیدا ہر اک ببول سے سرو و سمن کو میں

لاہور سے مرید کے آجانے کا ذکر تھا کہ مولانا کی صحبتیں یاد آگئیں اور 'لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم'۔ ہمارے ایک نئے رفیق ملک محمد اشرف شادی شدہ تھے۔ یہاں آنے کے بعد میری اور میر صاحب کی بھی شادی ہو گئی۔ اب ہاسٹل کے طریقے پر رہنا ممکن نہ تھا۔ حالات میں جو تبدیلی آئی تھی، اُس کی بنا پر ضروری تھا کہ رفقا کی کفالت کے لیے کوئی معقول بندوبست کیا جائے۔ ہم نے بہت کوشش کی، مگر اِس کے لیے جتنے وسائل چاہییں تھے، وہ کسی طرح میسر نہیں ہوئے۔ لہٰذا کم و بیش دو سال تک مرید کے میں بقا کی جدوجہد کے بعد ہم اِس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اِس ادارے کی بساط لپیٹ دی جائے۔ یہ 1978ء کے اپریل کی کوئی شام تھی، جب ہم نے کئی دن کی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر فیصلہ کر لیا اور برسوں کے ساتھی بادل نخواستہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے۔ اِس عرصے میں ''اشراق'' کا ڈیکلریشن مل گیا تھا۔ یہ مستنصر میر کے نام تھا۔ اِس کا پہلا شمارہ جنوری 1979 میں شائع ہوا۔ رسالے کا اداریہ اِسی موضوع پر تھا

اور میں نے اُس میں لکھا تھا:

”... نومبر 1970 میں وہ اکیڈیمی وجود میں آئی جو ”دارالاشراق“ کے نام سے لاہور سے 26 کلو میٹر دور مرید کے کی بستی میں اپریل 1978 تک باقاعدگی سے کام کرتی رہی اور اب کئی ماہ سے معطل ہے۔ میرے کچھ رفقا برسوں کی جدوجہد کے بعد گھروں کو لوٹ چکے ہیں، کچھ لوٹ جائیں گے۔ یہ ایک کام تھا جو شروع ہوا اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے سعی وجہد کے بے شمار مراحل سے گزرا اور ختم ہو گیا۔ میرے احباب کا تقاضا ہے کہ میں اِس کام کی نوعیت اور اِس کے تعطل کے وجوہ واسباب پر قلم اٹھاؤں تاکہ وہ لوگ جو اِس کے احیا سے دل چسپی رکھتے ہیں، اگر کچھ کرنے کی ہمت رکھتے ہوں تو کر سکیں۔ میں نہیں جانتا کہ اِس کا دوبارہ آغاز کب ہو سکے گا، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مجھے یقین ہے کہ کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ میرا احساس ہے کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ میرے پروردگار نے چاہا تو یہ قافلہ پھر گرم سفر ہو گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ منتشر ہو گیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دم لینے کے لیے کسی منزل پر ٹھیر گیا ہے۔ شاید زادراہ لینے کے لیے، شاید نئے سفر کا آغاز کرنے کے لیے۔ میں آواز جرس سن رہا ہوں اور میں نے قلم اٹھا لیا ہے۔“

اِس سے آگے میں نے لکھا تھا:

”... یہ بات شروع ہی سے میرے سامنے تھی کہ یہ کوئی جزوقتی کام نہیں ہے۔ اِس کے لیے آنے والوں کو شب وروز کے لیے آنا ہو گا اور ساری زندگی کے لیے آنا ہو گا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اِس میں اپنا سب کچھ کھپا دینے کے لیے آئیں گے، اُن کی کفالت کی ذمہ داری بالآخر اِس ادارے کو اٹھانا ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے میں نے یہ کام دو جہتوں سے شروع کیا۔ مردان کار کی تلاش اور وسائل کی فراہمی کی جدوجہد میں نے ایک ہی وقت میں شروع کی۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ پہلے کام کے لیے میرا مزاج موزوں تر اور دوسرے کے لیے سخت ناموزوں واقع ہوا ہے، اور اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے ارباب عزم کو جمع کر لینے میں جہاں غیر معمولی کامیابی ہوئی، وسائل کو تلاش کرنے میں ویسی ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اِس داستان کو بالتفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہ فرہاد و بیستوں کی حکایت ہے، خار مغیلاں کو خون دل سے سیراب کرنے کی کہانی ہے۔ میں اِس کو یہاں بہت اختصار کے ساتھ رقم کر رہا

ہوں۔ خاطر احباب کی گراں باری کا احساس ہے، لیکن اِسے چند حرفوں میں بیان کرنے کا موقع شاید یہی ہے:

پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

یہ کام کب شروع ہوا، عرض کر چکا ہوں۔ ابتدا مشکل تھی، ہو گئی تو احباب وقتاً فوقتاً اِس کام سے متعلق ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ 1975ء میں اُن کی تعداد سات تک پہنچ گئی۔ اِن میں افضال احمد صاحب اور محمد اشرف صاحب نے معاشیات، ساجد علی صاحب نے فلسفہ، الیاس احمد صاحب نے سیاسیات، محمد رفیق صاحب نے عربی اور مستنصر میر صاحب نے انگریزی میں ایم۔اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ منصور الحمید صاحب ایم بی بی ایس تھے۔ مستنصر میر صاحب نے سی ایس ایس کیا تھا اور سول سروس اکیڈیمی میں ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد تقرر سے کچھ روز پہلے ملازمت کا خیال چھوڑ کر حلقۂ درویشاں میں شامل ہو گئے تھے۔ اِن میں سے ہر فرد کا ایثار بے مثال ہے۔ یہ بڑی صلاحیتوں کے حامل نوجوان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن کی عزیمت، اِن کا ذوق علم، اِن کا حسن طبیعت، اِن کا سوز نہاں اِس اکیڈیمی کی تاریخ کی متاع بے بہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود میں نے اِن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرا احساس ہے کہ یہ آنے والے دور کو بہت کچھ دے سکتے تھے۔ لیکن اپنے زمانۂ قیام میں یہ شاید ہی چند ماہ کے لیے اطمینان کے ساتھ کام کر سکے ہوں۔ مالی وسائل کی کمی نے اِس کام کو بار بار معطل کیا ہے۔ اِس کی پوری تاریخ مسلسل بحران کی تاریخ ہے۔ یہاں تدریس بار بار شروع ہو کر ختم ہوئی ہے۔ اِس کے باوجود اللہ کا احسان ہے کہ کچھ کام ہو گیا اور بہت تھوڑا باقی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈیڑھ دو سال مزید کام کرنے کا موقع مل جاتا تو اِس کاوش کا مرحلۂ اول مکمل ہو جاتا۔ اب یہ سب کچھ معطل ہے اور مرید کے کی اِس ارض عقیم میں ہم خدائے لم یزل کے چند ناتواں بندے ایک نئے عزم کے ساتھ اِس کے احیا کے لیے کوشاں ہیں۔ معلوم نہیں، عرصۂ تعطل کب ختم ہو گا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس کام کو ضائع نہیں کریں گے۔"

میری جدوجہد کا پہلا مرحلہ یہاں ختم ہو گیا۔ لاہور واپس آنے کے بعد خیال تھا کہ اب صرف رسالہ نکالوں گا۔ "اشراق" کا ڈیکلریشن مستنصر میر کے نام پر مل گیا تھا، لیکن ابھی دو شمارے ہی نکلے تھے کہ میر صاحب کے امریکہ جانے کا پروگرام بن گیا۔ پھر میرے اور اُن کے درمیان

رسالے کی پالیسی کے بارے میں بھی کچھ اختلاف تھا۔ لہٰذا یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور ''اشراق'' ایک مرتبہ پھر بند کرنا پڑا۔

اِن دنوں چند طلبہ میرے پاس عربی ادب کی بعض کتابیں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ مولانا ابوشعیب صفدر علی اور مسعود اکبر پاشا اِن میں سب سے نمایاں تھے۔ ابوشعیب سرگودھا کے ایک عالم اور مولانا حسین علی واں بھچراں کے شاگرد رشید مولانا غلام نقشبند کے فرزند ارجمند تھے۔ اُن کی غیر معمولی صلاحیتوں کے پیش نظر میری خواہش تھی کہ وہ لاہور منتقل ہو جائیں۔ مرید کے کے دور ابتلا میں جن لوگوں نے ہمارے ساتھ غیر معمولی تعاون کیا، اُن میں ہماری برادری کے ایک بزرگ ڈاکٹر فرخ حسین ملک بھی تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو توجہ دلائی تو اُنھوں نے ''فرخ فاؤنڈیشن'' کے نام سے ایک ادارہ بنا دیا جس کے مہتمم مستنصر میر کے والد گرامی صفدر میر بنائے گئے۔ اُنھوں نے میرے ہی ایما سے ایک مجلہ ''الاعلام'' کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس میں اگرچہ میرا نام بھی لکھا گیا، لیکن تمام عملی ضرورتوں کے لیے ابوشعیب اُس کے مدیر مقرر کیے گئے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اِس کے نتیجے میں اُن کے لیے لاہور میں قیام کے اسباب میسر ہو گئے ہیں، لیکن یہ رسالہ بھی زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ ڈیڑھ دو سال بعد ہی مولانا ابوشعیب کو پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور رسالہ بند ہو گیا۔ یہی دن تھے، جب میں نے استاذ امام سے عرض کیا کہ اب حلقۂ تدبر قرآن کو بھی ایک باقاعدہ ادارے میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ یہ حلقہ اُن کی جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد قائم ہوا تھا۔ مولانا نے یہ تجویز پسند فرمائی۔ اُن کے ایما سے میں نے اِس کا دستور لکھا اور ''ادارۂ تدبر قرآن و حدیث'' کے نام سے یہ ادارہ قائم ہو گیا۔ سہ ماہی ''تدبر'' اِسی ادارے کے تحت شائع ہوتا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ پیش نظر مقاصد کے لیے اب اِسی میں کام کیا جائے، مگر بہت جلد واضح ہو گیا کہ حلقہ کے بزرگ اِسے پسند نہیں کریں گے۔ اِس کے بعد یہی مناسب تھا کہ کوئی کشمکش پیدا کرنے کے بجاے ادارے سے الگ ہو کر اپنے طریقے پر کام کرتا رہوں۔

اُس زمانے میں طلبہ کی ایک جماعت مجھ سے پڑھ رہی تھی۔ اُن میں ایک نعیم رفیع بھی تھے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آتے تو بار بار اصرار کرتے کہ اُس کام کا احیا ہونا چاہیے جو 1978ء میں ختم ہو گیا تھا۔ پچھلے تجربات کی وجہ سے میں اِس کے لیے راضی نہ تھا۔ پھر خالد ظہیر اور آفتاب شمسی

جیسے احباب بھی اُن کے ہم نوا ہو گئے تو بالآخر میں آمادہ ہوا۔ سعید نواز صاحب ہمارے دوستوں میں سب سے بزرگ تھے۔ اُن کی سربراہی میں ایک مجلس منتظمہ بنائی گئی۔ اِس کی افتتاحی تقریب استاذ امام امین احسن اصلاحی کے زیر صدارت لاہور کے جناح ہال میں منعقد ہوئی جس میں ارباب علم و دانش کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور جون 1983 میں وہ ادارہ وجود میں آ گیا جو اب ''المورد'' کے نام سے 51 کے ماڈل ٹاؤن میں قائم ہے۔ اِس کے کچھ عرصہ بعد 1985ء میں ''اشراق'' کا احیا بھی ہو گیا۔ ڈیڑھ دو سال یہ ایک مجلے کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ 1987ء میں مجھے اِس کا ڈیکلریشن مل گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُس وقت سے اب تک یہ رسالہ بغیر کسی انقطاع کے نکل رہا ہے۔ ''رینی ساں'' 1990ء میں نکلنا شروع ہوا۔ وہ بھی اِسی طرح جاری ہے۔ یہ رسالہ ابتدا ہی سے عزیزم شہزاد سلیم کے سپرد ہے۔ ''اشراق'' میرے پاس رہا، مگر اِس کو بھی اب میں نے اپنے بیٹے جواد احسن کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ کی مدد شامل حال رہی تو یہ اِسی طرح جاری رہیں گے۔

پچھلے پچیس برسوں میں ''الانصار المسلمون'' اور ''دانش سرا'' کا نظم بھی میرے تعلق سے قائم ہوا اور مولانا وصی مظہر صاحب ندوی اور ڈاکٹر محمد فاروق خان جیسے زعما اِن تنظیموں کے سربراہ رہے، مگر اِن کی عمر چند برسوں سے زیادہ نہیں ہوئی۔ ''المورد''، البتہ گذشتہ ربع صدی سے قائم ہے اور اللہ کی عنایت سے توقع ہے کہ قائم رہے گا۔ 87ء کے بعد ابتلا اور تعطل کا ایک زمانہ اِس پر بھی گزرا ہے، مگر 1991ء میں ہمارے دوست الطاف محمود کی مساعی سے اِس کے احیا کے بعد، اللہ کا شکر ہے کہ اِس کے کاموں میں کبھی کوئی تعطل پیدا نہیں ہوا۔

یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل مسلمانوں کے اندر صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ مذہبی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن چکے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع کی تحصیل اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس کا بنیادی مقصد اسلامی

علوم سے متعلق علمی اور تحقیقی کام، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اِس کی نشر واشاعت اور اِس کے مطابق لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

1۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

2۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان واخلاق کی تعلیم دی جائے۔

3۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

4۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر وعبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگی قلب و نظر کا اہتمام کریں۔ میری تمام سعی وجہد کا محور اب یہی ادارہ ہے۔ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں، اپنے علمی کاموں کے علاوہ اِسی کے لیے خاص کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے علم و عمل میں اخلاص کی دعا ہے:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

[2007ء]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(3)

باب اول

'آیۃ' کا مفہوم اور مصداق

شق قمر کے واقعے کو قرآن مجید نے 'آیۃ' سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ. (القمر 54:2-1)

"وہ گھڑی قریب آ گئی، جس سے اِنھیں خبردار کیا جا رہا ہے اور چاند شق ہو گیا۔ (مگر یہ نہ مانیں گے) اور خواہ کوئی آیت دیکھ لیں، اُس سے منہ ہی موڑیں گے اور

کہیں گے: یہ تو جادو ہے، جو پہلے سے چلا آ
رہا ہے۔‘‘

’آیۃ‘ عربی زبان کا نہایت معروف لفظ ہے۔ اِس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ اِس سے وہ مظاہر مراد ہیں، جو کسی مضمر شے یا حقیقت یا واقعے کی نشان دہی کریں۔ مثال کے طور پر نشاناتِ راہ راستوں کا پتا دیتے ہیں، آثارِ قدیمہ اجڑے دیار کی یادگار ٹھہرتے ہیں اور تخلیقات اور مصنوعات اپنے اپنے خالق یا صانع سے باخبر کرتی ہیں۔[1] اِن کا باہمی تعلق گویا اشارہ اور مشار الیہ کا ہوتا ہے، جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآنِ مجید کے بعض مقامات پر لفظِ ’آیۃ‘ اِس لغوی معنی میں بھی استعمال ہوا۔ سورۂ یونس میں فرعون کی لاش کو عذاب الٰہی کے واقعے کی نشانی کے طور پر باقی رکھنے کا فیصلہ مذکور ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَکَ اٰیَۃً ؕ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ. (92:10)

’’سو آج ہم تیرے بدن کو بچا لیں گے تاکہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے تو (خدا کے عذاب کی) نشانی بن کر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہی رہتے ہیں۔‘‘[2]

---

[1]۔ لسان العرب 8/58۔ المفردات فی غریب القرآن 33۔

[2]۔ ’’خدا کی یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ فرعون کی لاش کو غرقابی کے بعد سمندر نے قبول نہیں کیا، بلکہ عذاب الٰہی کی ایک عبرت ناک نشانی کے طور پر باہر پھینک دیا۔ یہ لاش بعد میں لوگوں کو ملی بھی اور اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کے مقابلے میں سرکشی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جزیرہ نماے سینا کے مغربی ساحل پر جبل فرعون اور حمام فرعون اِسی واقعے کی یادگاریں ہیں۔ ابوزنیمہ سے چند کلومیٹر اوپر شمال کی جانب علاقے کے باشندے آج بھی اُس جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں، جہاں یہ لاش پڑی ہوئی ملی تھی۔ دورِ حاضر میں اہل مصر کی جو ممی کی ہوئی لاشیں دریافت ہوئی ہیں، اُن میں سے بھی ایک لاش کے بارے میں، جسے فرعون منفتہ کی لاش قرار دیا جاتا ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ اُسی فرعون کی لاش ہے۔ یہ

سورۂ شعرا میں قوم عاد کے اِس عمل کو کارِ لاحاصل قرار دیا ہے کہ وہ بلند و بالا عمارتوں کی صورت میں اپنی عظمت کے نشان قائم کرتے تھے۔ ارشاد ہے:

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ. وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ. (128-129:26)	”(یہ تمھارا کیا حال ہے)؟ کیا ہر اونچی زمین پر تم اِسی طرح لاحاصل یادگاریں بناتے رہو گے؟ اور اِسی طرح بڑے بڑے محل تعمیر کرتے رہو گے گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے؟“

علامت، نشانی، یادگار کے بنیادی مفہوم سے آگے بڑھ کر قرآن نے اِسے اپنی ایک اصطلاح کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ اِس اعتبار سے یہ لفظ انفس و آفاق کے اُن دلائل کے لیے استعمال ہوا ہے، جو اللہ پروردگارِ عالم کی صفاتِ عالیہ کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ صفات اللہ کی عظمت، خلقت، قدرت، رحمت، ربوبیت، عدالت اور علم و حکمت سے عبارت ہیں۔ انسان کی عقل و فطرت اِن کے شعور کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ اگر اِسے درست طریقے سے استعمال کرے تو اللہ کی معرفت کی راہ تک پہنچ سکتا ہے۔ انسان کی جو صلاحیتیں اِس معاملے میں اُس کی رہنمائی کرتی ہیں، وہ غور و فکر، عقل و ادراک اور ذکر و تذکیر ہیں۔ قرآن مجید نے اِنھیں 'يَتَفَكَّرُوْنَ'، 'يَعْقِلُوْنَ' اور 'يَذَّكَّرُوْنَ' سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ. هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ. يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ	”(اُس کو پانا چاہتے ہو تو جان لو کہ) اللہ تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے، جب کہ راہیں ٹیڑھی بھی ہیں۔ اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو اُسی ایک راہ کی ہدایت دے دیتا۔ وہی ہے، جس نے آسمان سے پانی اتارا، جس سے تم پیتے بھی ہو اور اُسی سے وہ نباتات بھی اگتی ہیں، جن میں تم

لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔“ (البیان 2/457)

يَّتَفَكَّرُوْنَ.

مویشیوں کو چراتے ہو۔ وہ تمھارے لیے اُسی سے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ یقیناً اِس میں اُن لوگوں کے لیے بہت بڑی نشانی ہے، جو غور کریں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ.

رات اور دن اور سورج اور چاند کو اُسی نے تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور اُسی کے حکم سے ستارے بھی تمھارے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یقیناً اِس میں اُن لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو عقل سے کام لیں۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ.(النحل16:13-9)

اور یہ جو رنگ رنگ کی چیزیں اُس نے تمھارے لیے زمین میں بکھیر دی ہیں، اُن میں بھی یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، اُن لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں۔"

اِس سے واضح ہے کہ اللہ کی نشانیاں اُس کی ذات و صفات کی معرفت کے لیے ایک وسیلے کا کردار ادا کرتی ہیں۔ گویا صفاتِ الٰہی اور آیاتِ الٰہی کے مابین علت و معلول اور سبب اور مسبب کا تعلق ہے۔ صفات کا مظہر آیات ہیں اور آیات کو دیکھ کر صفات کو پہچانا جا سکتا ہے۔ استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی نے اپنی کتاب ''میزان'' میں جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں قرآنِ مجید کے موقف کو بیان کیا ہے، وہاں صفات اور آیات کے باہمی تعلق کو بھی واضح کیا ہے۔ اِس بیان کے چند متعلقہ اجزا درج ذیل ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ وہ کسی طرح انسان کے حیطۂ ادراک میں نہیں آ سکتی۔ اِس لیے کہ ادراک کے ذرائع جس ہستی نے پیدا کیے ہیں، وہ تو یقیناً اُنھیں پا سکتی اور اُن کا احاطہ بھی کر سکتی ہے، لیکن یہ ذرائع کسی طرح اُس کا احاطہ نہیں کر سکتے، جو خود اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔...

اللہ تعالیٰ کی صفات، البتہ کسی نہ کسی درجے میں انسان کی گرفت میں آتی ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ صفات سے متعلق کچھ چیزیں، خواہ وہ کتنی ہی حقیر ہوں، انسان کے پاس بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم و خبر، قدرت، ربوبیت اور رحمت و حکمت سے کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرمایا ہے۔ اِس پر قیاس کر کے خدا کی اِن صفات کا کچھ تصور ہم قائم کر سکتے ہیں۔... تاہم اِس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی عقل کو بیدار رکھے اور وحی الٰہی کی رہنمائی میں انفس و آفاق کے اندر خدا کی آیات پر غور کرتا رہے۔ قرآن نے اپنے مخاطبین کو اِسی بنا پر بار بار تعقل، تفکر اور تذکر کی دعوت دی ہے... اِس طریقے سے غور کیا جائے تو انفس و آفاق کی ہر چیز گواہی دیتی ہے کہ خدا محض علت العلل اور واجب الوجود نہیں ہے کہ جس سے سلسلۂ علت و معلول شروع ہوا اور جو ہر حال میں تھا اور ہے اور رہے گا، بلکہ ایک ایسی صاحب ارادہ و ادراک ہستی ہے، جو تمام اعلیٰ صفات کی حامل ہے۔'' (99-96)

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ 'آیۃ' کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بیان ہو تو اُس سے مراد انفس و آفاق کی وہ نشانیاں ہوتی ہیں، جو اُس کی مختلف صفات کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ یہ اِس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ خالق کائنات ہے، مالکِ ارض و سما ہے اور مشرق و مغرب کا رب ہے۔ لطیف و خبیر ہے، سمیع و بصیر ہے، رؤف و رحیم ہے، عزیز و حکیم ہے، بکل شیء علیم اور علیٰ کل شیء قدیر ہے۔ چنانچہ جب قرآنِ مجید انسانوں کو اِن صفات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے تو وہ اِنھی آیات بینات کو بہ طورِ دلیل پیش کرتا ہے اور اِس طرح اُن کے لیے تذکیر و ترغیب، تہدید و تخویف اور تنبیہ و تعذیب کا سامان کرتا ہے۔

انفس و آفاق کی یہ نشانیاں ہر لحاظ سے واضح اور نمایاں ہیں۔ دیکھنے والی آنکھیں اِنھیں دیکھ سکتی، عقل والے دماغ اِنھیں سمجھ سکتے اور بصیرت والے دل اِن سے خالق کی معرفت حاصل کر سکتے اور انجام سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود اگر وہ اِن کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں تو اللہ تعالیٰ نے مزید اہتمام کرتے ہوئے اِنھیں اپنی کتاب میں بالتفصیل بیان کر دیا ہے تاکہ ابہام و اشکال کی کوئی گنجایش باقی نہ رہ جائے۔ ارشاد ہے:

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ. (یونس 5:10)	''وہ اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں، اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے۔''
يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ	''وہ اپنی اِن نشانیوں کی وضاحت

رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ. (الرعد 13:2) کرتا ہے، اِس لیے کہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین کرو۔''

استاذِ گرامی سورۂ رعد کی مذکورہ آیت کی شرح میں لکھتے ہیں:

''یعنی اپنی کتاب میں اِن (نشانیوں) کی تفصیل کرتا ہے تاکہ جن حقائق پر یہ دلالت کر رہی ہیں، تم اُن کو سمجھو اور اِس کے نتیجے میں کائنات کی اِس عظیم حقیقت کا یقین حاصل کر لو کہ جس نے اپنی بے پایاں قدرت اور کمال حکمت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے، وہ اِسے اتمام و تکمیل تک پہنچائے بغیر یوں ہی ختم نہیں ہونے دے گا، بلکہ لازماً اُس منزل تک لے جائے گا، جو اِس کے لیے مقرر ہے۔'' (البیان 2/573)

درج بالا تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ 'آیۃ' کے لغوی معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ اِس سے مراد وہ ظاہری شے ہے، جو کسی مخفی شے یا حقیقت کی نشان دہی کرے۔ جیسا کہ مثال کے طور پر تخلیق تخلیق کار کی، مصنوع صانع کی اور تصویر مصور کی نشان دہی کرتی ہے۔ قرآنِ مجید کی اصطلاح میں اِس سے مراد انفس و آفاق کے وہ دلائل و براہین ہیں، جو اللہ کی ذات و صفات کے عرفان کی منزل تک پہنچنے کے لیے نشاناتِ راہ کا کردار ادا کرتے ہیں اور انسان کو اُس کے اخروی انجام سے باخبر کرتے ہیں۔

اِس اصطلاحی مفہوم میں اِس لفظ کے چار مختلف اطلاقات متعین ہوتے ہیں:

1۔ انفس و آفاق میں معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

2۔ انفس و آفاق میں معمول کے خلاف ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

3۔ انفس و آفاق میں نبیوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی

4۔ انفس و آفاق میں ظاہر ہونے والی جملہ آیاتِ الٰہی کو بیان کرنے والی آیاتِ قرآنی

آیئے اِن چاروں اطلاقات کو قرآنِ مجید کی روشنی میں قدرے تفصیل سے سمجھتے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں اِس امر کو جاننا آسان ہو جائے گا کہ شق القمر کے واقعے کو اِن میں سے کس کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔

[باقی]

نعیم احمد بلوچ

تخت سلیمان کے دھڑ کی حقیقت

[''نقد نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

قرآن مجید میں متعدد ایسے مقامات ہیں جن کی حقیقت جاننے پر بہت اختلافات ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے بعض ذہنوں میں یہ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ:

1۔ قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ وہ سمجھنے کے لیے بہت آسان کتاب ہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے متعدد مقامات کو سمجھنے میں اس قدر مشکلات پیش آتی ہیں؟ کیا یہ مشکلات قرآن کے دعوے کے خلاف نہیں؟

2۔ ایسے مقامات کی اب ایسی تشریحات سامنے آ گئی ہیں جن سے بظاہر بات سمجھ میں آ جاتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے کیا اہل علم نے قرآن پر غور ہی نہیں کیا تھا؟ آخر آج کے لوگوں کے پاس کون سا ہنر آ گیا ہے کہ صدیوں پرانی گتھیاں صرف ان ہی پر کھل رہی ہیں؟

3۔ اسلام کے دور اول میں جو لوگ قرآن کی زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھے، ہم ان کی تشریح کو کیوں نہ مانیں؟ ان کی تشریح صاف بتاتی ہے کہ یہ اس دور کی ایک خود ساختہ کتاب تھی

اور اس کی حقیقت اب واضح ہو رہی ہے، لیکن کچھ قدامت پسند یا جن کی اس قرآن اور اسلام سے معاش وابستہ ہے، اس کی لچھے دار تشریحات کر کے لوگوں کو پھر لُبھا رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ قرآن کا اصل اور حقیقی فہم وہی ہے جو اس کے اولین لوگوں نے سمجھا۔ اور اس کے مطابق قرآن محض پرانے قصے کہانیوں کی کتاب ہے۔

ہم نے قرآن کے ایسے ہی موضوعات کا انتخاب کیا ہے جن پر اس قسم کے سوالات کیے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک مقام قرآن مجید کی سورۂ ص کی آیات 34 اور 35 ہیں۔ ان آیات کے بارے میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ''تفہیم القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''یہ مقام قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے اور حتمی طور پر اس کی کوئی تفسیر بیان کرنے کے لیے ہمیں کوئی یقینی بنیاد نہیں ملتی۔'' (4/338)

اس نشست میں ہم انھی آیات کے بارے میں مطالعہ کریں گے:

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ. قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. (سورۂ ص 38:35-34)

آیات کا سادہ ترجمہ یہ ہے:

''ہم نے سلیمان کو (ایک اور) آزمایش میں بھی ڈالا تھا اور اُس کے تخت پر ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا تھا۔ پھر اُس نے رجوع کیا۔ اور دعا کی: اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھے ایسی سلطنت بخش جو میرے سوا کسی کے لیے زیبا نہ ہو۔ تو بڑا ہی بخشنے والا ہے۔''

بعض مفسرین نے 'جَسَدًا' کو 'اَلْقَيْنَا' کا مفعول قرار دے کر اس کا ترجمہ یہ کیا ہے:

ہم نے سلیمان کو ایک آزمایش میں ڈالا اور اس کے تخت پر ایک جسد لا کر ڈال دیا۔

یہ ترجمہ کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہو گئے کہ:

1۔ جو جسد ڈالا گیا وہ کیا تھا، اس سے کیا مراد ہے؟

2۔ اس میں آزمایش کس پہلو سے تھی؟

3۔ اس آزمایش کا اگلی دعا سے کیا تعلق ہے؟

بنیادی طور پر اس آیت کو دو طرح سے سمجھا گیا۔ جن مفسرین نے ان آیات کو روایات سے سمجھنے کی کوشش کی، انھوں نے 'جَسَدًا' کو مفعول سمجھا اور ان روایات کے مطابق ان آیات کی

تفسیر کی۔ یہ روایات متعدد ہیں اور ان میں سے کسی ایک پر مفسرین متفق بھی نہیں ہوئے۔ البتہ تین آرا نمایندہ کہی جاسکتی ہیں۔ اس میں دو آرا اسرائیلیات سے ہیں اور ایک بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے۔

پہلی رائے کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد رحمہ اللہ، سعید بن جبیر رحمہ اللہ، حسن رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ ابن کثیر اس رائے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے قوی سند کے ساتھ مروی ہے۔ قرآن مجید کے پہلے مفسر ابن جریر طبری (پیدایش 224ھ) نے بھی اس کی اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ رائے کا خلاصہ یہ ہے:

ان آیات میں 'جسد' سے مراد ایک شیطان جن ہے۔ اس نے سلیمان علیہ السلام کی شکل اختیار کرکے وہ انگوٹھی ہتھیا لی جس کو پہن کر سلیمان علیہ السلام سارا نظام سلطنت چلاتے تھے۔ اور ایسا اس لیے ہوا تھا کہ سلیمان علیہ السلام کے محل میں ان کی ایک چہیتی ملکہ چالیس دن تک اپنی کنیزوں کے ساتھ بُت پرستی کرتی رہی اور سلیمان علیہ السلام اس سے غافل رہے۔ اس کا خمیازہ آپ کو انگوٹھی سے محرومی کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ اس جن نے آپ کے تخت پر قبضہ کر لیا اور سلیمان علیہ السلام اپنی سلطنت سے الگ کر دیے گئے۔ چالیس دن تک وہی جن سلطنت کے امور چلاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہی سلیمان علیہ السلام کے حرم میں جاتا رہا۔ پھر لوگوں کو شک ہوا۔ انھوں نے اس جن کو تورات پڑھنے کو کہا تو اس کی اصلیت لوگوں پر کھل گئی۔ وہ وہاں سے بھاگا اور انگوٹھی دریا میں پھینک دی۔ اسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ اتفاق سے یہی مچھلی سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ تخت سے محرومی کے بعد مچھلیاں پکڑنے کی مزدوری کرنے لگ گئے تھے اور یہ مچھلی انھیں مزدوری میں ملی تھی۔ انھوں نے مچھلی کا پیٹ کاٹا تو انگوٹھی مل گئی۔ اس سے ان کی ساری طاقتیں بحال ہو گئیں اور وہ دوبارہ سلطنت کے مالک ہو گئے۔ یوں یہ شیطان جن وہ جسد تھا جسے تخت سلیمان پر ڈالا گیا تھا۔ اس کے بعد سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی کہ انھیں ایسی سلطنت عطا ہو جو کوئی ان سے چھین نہ سکے۔

امام رازی سمیت بہت سے مفسرین نے اس پر سخت تنقید کی ہے کہ اگر شیطان جن پیغمبروں کا روپ دھار لیں تو پورا دین ہی مشتبہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ اسے قرآن کے بھی خلاف قرار دیا

ہے۔ اس میں تو حضرت سلیمان علیہ السلام سے ایک بڑی غلطی یا غفلت کا صدور ہوا ہے۔ یہ آزمایش کس پہلو سے ہے؟ اور اسے اسرائیلیات سے ماخوذ قرار دے کر رد کر دیا ہے۔

دوسری رائے طبرانی اپنی ''الاوسط'' میں لائے ہیں۔ ابن مَردَویہ نے اسے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ الامامیہ نے اس رائے کو ابو عبد اللہ سے روایت کیا ہے اور یہی رائے شعبی سے بھی روایت کی گئی ہے۔ اس رائے کے بارے میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کی سند کمزور ہے۔ اس کے باوجود اسے تفاسیر میں ایک رائے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کے مطابق سلیمان علیہ السلام کے ہاں بیس سال کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا۔ شیاطین جن نے یہ دیکھ کر کہا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا اور سلیمان کے بعد تخت پر بیٹھ گیا تو ہم سلیمان کے بعد پھر اس کی غلامی میں گرفتار رہیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اسے قتل کرنے کی سازش کی۔ سلیمان علیہ السلام کو اس سازش کا پتا چل گیا۔ انھوں نے بیٹے کو بادلوں میں چھپا دیا۔ سلیمان علیہ السلام کا یہ اقدام ہی وہ گناہ اور آزمایش تھی جس میں وہ مبتلا ہوئے، یعنی انھوں نے خدا کے بجاے بادلوں پر توکل کیا۔ اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ چنانچہ ایک موقع پر جب کہ آپ اپنی جنگی مہمات میں مصروف تھے، وہ لڑکا بادلوں سے مردہ حالت میں آپ کے تخت پر آن گرا۔ تب سلیمان علیہ السلام کو احساس ہوا کہ انھوں نے خدا پر توکل نہیں کیا۔ انھوں نے توبہ کی۔ پس ان آیات میں جسد سے مراد حضرت سلیمان کا وہ مردہ بیٹا ہے جو تخت پر آن گرا تھا۔

اس تاویل کو بھی کمزور روایت اور قرآن کے خلاف قرار دے کر رد کیا گیا ہے۔ اور سلیمان علیہ السلام کے دور میں ایسے کسی تاریخی واقعے کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ پھر اس سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ سلیمان علیہ السلام کی دعا کا اس واقعے سے کیا تعلق ہے؟

اس سلسلے کی سب سے مشہور تاویل جسے مفسرین کی اکثریت مانتی ہے، وہ ایک متفق علیہ حدیث پر مبنی ہے:

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی ھریرۃ قال: قال سلیمان	''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے
لاطوفن اللیلۃ علی تسعین امراۃً.	روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
کل تلد غلامًا یقاتل فی سبیل اللہ	فرمایا: سلیمان نے قسم کھائی کہ میں ضرور

فقال له صاحبه قال سفیان یعنی الملك قل ان شاء اللّٰه فنسی فطاف بهن فلم تات امراة منهن بولد الا واحدة بشق غلام فقال ابوهریرة یرویه قال لو قال ان شاء اللّٰه لم یحنث وکان درکا فی حاجته.

(بخاری، رقم 3424)

آج رات اپنی نوے بیویوں کے پاس جاؤں گا۔ ان میں سے ہر بیوی ایک لڑکا جنے گی جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو گا۔ سفیان راوی بتاتے ہیں کہ ان کے ساتھی یعنی فرشتے نے کہا: ان شاء اللہ کہیے، تو وہ بھول گئے۔ پھر آپ اپنی بیویوں کے پاس گئے بھی، لیکن ان میں سے صرف ایک عورت کے ہاں لڑکے کا آدھا جسم پیدا ہوا۔ پھر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ ان شاء اللہ کہتے تو ان کی قسم رائگاں نہ جاتی، بلکہ یہ (ان شاء اللہ کہنا) ان کے مقصد کے حصول (کا ذریعہ) ہوتا۔''

اس حدیث کی بنیاد پر یہ راے اختیار کی گئی کہ یہ جسد اصل میں یہی ادھورا بچہ تھا۔ عام طور پر اکثر مفسرین نے یہی راے اختیار کی ہے۔ لیکن اس راے پر صاحب تفہیم القرآن سید ابو الاعلیٰ مودودی نے بہت زور دار تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور اسے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے۔ خود ''بخاری'' میں مختلف مقامات پر یہ روایت جن طریقوں سے نقل کی گئی ہے، ان میں سے کسی میں بیویوں کی تعداد 60 بیان کی گئی ہے، کسی میں 70، کسی میں 90، کسی میں 99 اور کسی میں 100۔ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے، ان میں سے اکثر روایات کی سند قوی ہے اور باعتبار روایت اس کی صحت میں کلام نہیں کیا جا سکتا، لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہو گی، جس طرح وہ نقل ہوئی

ہے، بلکہ آپ نے غالباً یہود کی یاوہ گویوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر بہ طور مثال بیان فرمایا ہو گا۔ اور سامع کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ اس بات کو حضور خود بہ طور واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ ایسی روایت کو محض صحت سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔ ہر شخص خود حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ جاڑے کی طویل ترین رات میں بھی عشا اور فجر کے درمیان دس گیارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اگر بیویوں کی کم سے کم تعداد 60 ہی مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس رات بغیر دم لیے فی گھنٹا 6 بیوی کے حساب سے مسلسل دس گیارہ گھنٹے مباشرت کرتے چلے گئے۔ کیا یہ عملاً ممکن بھی ہے؟ اور کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حضور نے یہ بات واقعے کے طور پر بیان کی ہو گی۔ پھر حدیث میں یہ بات کہیں نہیں بیان کی گئی کہ قرآن مجید میں جس جسد کے ڈالنے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد یہی ادھورا بچہ ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حضور نے یہ واقعہ اس آیت کی تفسیر کے طور پر بیان فرمایا تھا۔ علاوہ بریں اس بچے کی پیدایش پر حضرت سلیمان کا استغفار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے استغفار کے ساتھ یہ دعا کیوں مانگی کہ ”مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔“

(تفہیم القرآن 4/ 337-338)

معروف اہل حدیث عالم حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ نے اس کا دفاع اس طرح کیا ہے:

”بعض لوگوں نے عقل و درایت کی رو سے اس واقعے پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ایک رات میں اتنی تعداد میں بیویوں کے ساتھ مباشرت کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ معجزات عطا فرماتا ہے۔ انھی معجزات میں ایک معجزہ قوتِ مردانگی بھی ہے، علاوہ ازیں ان کے اوقات میں برکت بھی ہے۔ اس اعتبار سے حضرت سلیمان کے واقعے کو عام انسانی معیار پر ماپنا اور پھر اسے عقل و درایت کے خلاف باور کرانا یکسر غلط ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس واقعے میں انبیا علیہم السلام کی اس خصوصیت کا بیان بھی ہے جو قوتِ جماع کی صورت میں اُن کو عطا کی جاتی ہے جو اُن کی بنیادی صحت، قوتِ بارآوری اور کمالِ مردانگی پر

دلالت کرتی ہے، حالانکہ انھیں عبادت اور علوم کے ساتھ بھی خصوصی اشتغال ہوتا ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ معجزہ اس سے زیادہ بلیغ انداز میں عطا کیا گیا تھا۔ آپ کا اپنے رب کی عبادت میں، علومِ ربانی میں اور مخلوق کی فلاح و بہبود میں اشتغال بہت زیادہ تھا، علاوہ ازیں آپ نہایت کم خور تھے جو کثرتِ جماع والے شخص کے لیے جسمانی کمزوری کا باعث ہے، اس کے باوجود آپ (بعض دفعہ) ایک ہی رات میں غسل واحد کے ساتھ اپنی گیارہ بیویوں کے ساتھ مباشرت فرمالیا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے جو جتنا زیادہ متقی ہوتا ہے، اس کی جنسی قوت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔" (فتح الباری: ج6، ص563، طبع دار السلام، الریاض)

یہ بات تو اپنی جگہ صحیح ہے کہ حضرت سلیمان کا یہ واقعۂ مباشرت حدیث میں آیتِ زیر بحث کی تفسیر کے طور پر بیان نہیں ہوا ہے۔ بہت سے مفسرین نے اپنے فہم کے مطابق اس آیت پر اس کا انطباق کیا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ دیگر تاویلات و توجیہات کے مقابلے میں جو بیش تر اسرائیلی روایات پر مبنی ہیں، یہ انطباق زیادہ صحیح ہے اور اس سے اس آیت کی ایک معقول توجیہ سامنے آجاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!" (محدث میگزین، شمارہ 251، اگست 2001)

حافظ صاحب کے بیان کے مطابق اس دفاع میں بھی یہ بات واضح ہے کہ انھیں یہ تاویل دوسری تاویلات سے بس بہتر نظر آئی ہے۔ وہ اسے یقینی اور حتمی نہیں کہہ رہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ان مفسرین میں نمایاں ہیں جنھوں نے "جسداً" کو مفعول بھی مانا ہے اور آیت کی تفسیر میں کسی روایت کو بھی قبول نہیں کیا۔ وہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"حضرت سلیمان کے یہ الفاظ "اے میرے رب! مجھے معاف کر دے اور مجھ کو وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو" اگر تاریخ بنی اسرائیل میں جائیں تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل میں غالباً یہ خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو اور حکومت و فرماں روائی آیندہ انھی کی نسل میں باقی رہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فتنہ قرار دیا۔ اور اس پر وہ اس وقت متنبہ ہوئے جب ان کا ولی عہد رَخُبعام ایک ایسا نالائق نوجوان بن کر اٹھا جس کے لچھن صاف بتا رہے تھے وہ داؤد و سلیمان کی سلطنت چار دن بھی نہیں سنبھال سکے گا۔ ان کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈالے جانے کا مطلب غالباً یہی ہے کہ جس بیٹے کو وہ اپنی کرسی پر بٹھانا چاہتے ہیں وہ ایک کندۂ ناتراش تھا۔ تب انھوں نے اپنی اس خواہش

سے رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر درخواست کی یہ بادشاہی مجھی پر ختم ہو جائے۔ میں اپنے بعد اپنی نسل میں بادشاہی جاری رہنے کی تمنا سے باز آیا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان نے اپنے بعد کسی کے لیے بھی جانشینی کی نہ وصیت کی اور نہ کسی کی اطاعت کے لیے لوگوں کو پابند کیا۔‘‘ (تفہیم القرآن 4/338)

مولانا محترم ایک تو ’غالباً‘ کے الفاظ سے یہ راے بیان کر رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کی راے کے بالکل خلاف قرآن اگلی ہی آیت میں حضرت سلیمان کی یہ دعا بیان کر رہا ہے کہ وہ اپنے لیے ایک بے مثل بادشاہی کی تمنا کر رہے ہیں۔ پھر حضرت سلیمان کی جانشینی کے حوالے سے بھی تاریخ میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی اور مولانا اسے بھی اپنا اندازہ بیان کر رہے ہیں۔ پھر ’’جسد‘‘ سے مستقبل میں بادشاہ ہونے والا شہزادہ مراد لینا بالکل ہی قرین قیاس نہیں۔

وہ مفسرین جنھوں نے جسد سے مراد خود حضرت سلیمان لیے ہیں اور کسی روایت کو قبول نہیں کیا، ان میں امام فخر الدین رازی، علامہ آلوسی اور دیگر شامل ہیں۔

’’تفسیر کبیر‘‘ میں امام رازی کے الفاظ یہ ہیں:

اقول لا یبعد ایضاً ان یقال انه ابتلاه اللّٰہ تعالیٰ بتسلیط خوف او توقع بلاء.(26/393)	’’میں کہتا ہوں کہ یہ بات بھی بعید نہیں کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خوف یا متوقع مصیبت کو غالب کر کے آپ کو آزمایا ہو۔‘‘

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام رازی رحمہ اللہ آیات کے اجمال کی کوئی واضح تفصیل نہیں کر رہے، بس ایک امکان ظاہر کر رہے ہیں جو درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ البتہ جسد سے مراد وہ سلیمان علیہ السلام کی کیفیت کو قرار دے رہے ہیں۔ اور اس سوال کا جواب تو بالکل ہی نہیں دیا گیا کہ دوسری آیت میں دعا کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

ان آیات کی ایک تاویل تفسیر ’’روح المعانی‘‘ میں ابو مسلم اور بعض دوسرے لوگوں کی راے کی حیثیت سے بیان کی گئی ہے۔ اس میں ’جسداً‘ کو مفعول ضمیر کا حال مان کر یہ کہا گیا ہے کہ یہ سلیمان علیہ السلام کی علالت اور ان کی پس ماندگی کی وجہ سے ان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ امام رازی نے اس راے کو محقق علما کے ایک گروہ کی طرف سے بیان کردہ راے کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس تاویل کی بھی مشکل یہ ہے کہ بیماری کا کوئی ذکر الفاظِ قرآنی میں نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی تاریخی شہادت ملتی ہے اور نہ اس تاویل سے یہ جواب ملتا ہے کہ اس کا مابعد دعا سے کیا تعلق ہے۔

ان تمام آرا کے بعد اب مولانا امین احسن اصلاحی اور جناب جاوید احمد غامدی کی رائے بیان کی جاتی ہے۔ وہ 'جسداً' کی نحوی ترکیب وہی کرتے ہیں، جو متعدد مفسرین پہلے کر چکے ہیں اور روایات کے بجاے ان آیات کے دروبست اور نظم قرآن ہی سے ان کو سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

''اور ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ہم نے اس کے تخت پر ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا۔ اس نے دعا کی: میرے رب، مجھے معاف فرما دے اور مجھے ایسی سلطنت بخش جو میرے سوا کسی کے لیے زیبا نہیں۔ تو بڑا ہی بخشنے والا ہے۔'' (تدبر قرآن 6/ 530-529)

مولانا اصلاحی ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انابت کا دوسرا واقعہ بیان ہو رہا ہے... تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ سخت امتحان پیش آیا کہ دشمنوں نے یورش کر کے ان کے بیش تر علاقے چھین لیے اور باقی علاقوں میں بھی ایسی گڑبڑ پھیلا دی کہ نظم حکومت عملاً بالکل درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ ان کی تاخت سے صرف مرکز بچا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام بالکل مجبور و محصور ہو کر رہ گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امتحان تھا، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام ایک خدا ترس بادشاہ تھے، اس وجہ سے انھوں نے یہ گمان فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کسی غلطی کی سزا دی ہے۔ اس احساس نے ان کے غم کو دوبالا کر دیا اور وہ اس غم اور بے بسی کی حالت میں اپنے تخت حکومت پر ایک جسد بے جان ہو کر رہ گئے۔ اس وقت انھوں نے نہایت تضرع کے ساتھ اپنے رب سے دعا کی کہ اے رب، میرے گناہ معاف کر اور اگرچہ میں تیرے فضل و انعام کا حق دار نہیں رہ گیا ہوں، لیکن تو بڑا بخشنے والا ہے، اس وجہ سے میرے عدم استحقاق کے باوجود مجھے ایسی بادشاہی دے جس کے سزاوار اس طرح کے گناہ کے ساتھ دوسرے نہ ہوتے ہیں، نہ ہوں گے۔''

(تدبر قرآن 6/ 533)

'وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یعنی ہم نے سلیمان کو امتحان میں ڈالا۔ یہ امتحان اللہ کی سنت ہے۔ ضروری نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کسی جرم ہی کی سزا کے طور پر امتحان میں ڈالے گئے ہوں۔ امتحان تمام نبیوں اور رسولوں کو پیش آئے ہیں جس سے ان کے صبر یا شکر کی آزمایش ہوئی ہے۔ اسی طرح کے ایک امتحان میں حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ڈالے گئے۔ اور چونکہ وہ ایک بادشاہ تھے، اس وجہ سے ان کو یہ امتحان ان کی بادشاہی کی راہ سے پیش آیا۔“

(تدبر قرآن 6/ 534-533)

مولانا کی راے میں آیت کو سمجھنے میں یہ ضروری ہے کہ اسے حضرت سلیمان کے حوالے سے سمجھا جائے۔ اسی لیے ان کی آزمایش کا تعلق حکمرانی سے ہی ہو سکتا ہے، بیماری سے نہیں جیسا کہ علامہ آلوسی نے ”روح المعانی“ میں یا دوسرے مفسرین نے خیال کیا۔

قرآن مجید نے سلیمان علیہ السلام پر آنے والے اس امتحان کو ’وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا‘ کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ ان الفاظ کی شرح وہ اس طرح کرتے ہیں:

”یہ نہایت مختصر، لیکن نہایت جامع لفظوں میں اس امتحان کا بیان ہے کہ کہاں تو وہ ایک وسیع الاطراف حکومت کے نہایت طاقت ور اور صاحب اقتدار بادشاہ تھے یا ہم نے ان کو ان کے تخت پر ایک بالکل جسد بے جان بنا کر ڈال دیا۔ لفظ ’جسد‘ یہاں بہ طور کنایہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بے بسی اور ان کے غم والم کی تصویر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی حکومت سمٹ سمٹا کر مرکز تک محدود رہ گئی اور حالات نے ان کو اس قدر بے بس اور غم زدہ بنا دیا کہ گویا صرف جسم رہ گیا، روح غائب ہو گئی۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ایک بے بس اور غم زدہ بادشاہ کی جو اپنے مرکز میں محصور ہو کر رہ گیا ہو، اس سے بہتر تصویر نہیں ہو سکتی۔“

(تدبر قرآن 6/ 534)

’ثُمَّ اَنَابَ‘ کی شرح کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

”یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام ایسے حالات میں بھی اپنے رب سے مایوس نہیں ہوئے، بلکہ ان کو احساس ہوا کہ یہ ان کی کسی غلطی پر ان کی پکڑ ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اسی کی طرف توبہ و استغفار کے لیے متوجہ ہوئے۔“ (تدبر قرآن 6/ 534)

دعا کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”(اس نے دعا کی: میرے رب، مجھے معاف فرما دے اور مجھے ایسی سلطنت بخش جو میرے سوا کسی کے لیے زیبا نہیں۔) اس دعا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تو مجھے ایسی بادشاہی دے، جیسی بادشاہی میرے بعد کسی اور کو نہ ملے، بلکہ ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ اگرچہ میں اپنے گناہ کے سبب سے کسی حکومت کا اہل تو نہیں رہ گیا ہوں، تاہم تو اپنے فضل سے مجھے ایسی بادشاہی دے جس کا سزاوار نہ میں ہوں، نہ میرے بعد کوئی اور ہو گا۔

... تو بڑا بخشنے والا ہے، اس وجہ سے میں بھی اپنی غلطیوں کے باوجود امیدوار ہوں کہ تو مجھے محروم نہیں فرمائے گا۔“ (تدبر قرآن 6/534)

دعا میں موجود الفاظ ’لَّا يَنۢبَغِيْ لِاَحَدٍ‘ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس دعا میں اصلی زور بادشاہی کی بے مثال عظمت و شوکت پر نہیں، بلکہ بلا استحقاق بادشاہی دیے جانے پر ہے کہ مجھے میرے گناہوں کے باوجود بادشاہی دے جب کہ میرے بعد کوئی اور اس کا سزاوار نہیں ٹھیرے گا۔ اس دعا میں اپنے گناہ کا جو شدید احساس ہے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی غایت خشیت و انابت کی دلیل ہے۔“ (تدبر قرآن 6/534)

جناب جاوید احمد غامدی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

”یعنی ایسا بے بس اور غم زدہ بنا دیا تھا کہ اُس کے تخت پر گویا صرف ایک جسم پڑا ہوا رہ گیا جس میں سے روح نکل گئی تھی۔ یہ اُن حالات کی طرف اشارہ ہے، جب دشمنوں نے یورش کر کے اُن کے بیش تر علاقے چھین لیے اور باقی مقامات پر بھی ایسی گڑبڑ پھیلا دی تھی کہ نظم حکومت بالکل درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان اُس زمانے میں اپنے دارالحکومت میں بالکل محصور و مجبور ہو کر رہ گئے تھے۔ قرآن نے اِس پوری صورت حال کو کمال بلاغت کے ساتھ ایک جملے میں سمیٹ دیا ہے کہ ہم نے سلیمان کو اُس کے تخت پر ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا۔“ (البیان 4/306)

مولانا امین احسن اصلاحی اور جناب جاوید احمد غامدی نے جن تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے، وہ بائیبل کی کتاب ”سلاطین“ کے گیارہویں باب میں بیان ہوئے ہیں۔ یہاں ہداد اور روزن بن الیدع کا ذکر ہے جنھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے بہت مسائل پیدا کیے۔ اسی طرح John Bright نے اپنی کتاب ”A History of Israel“ میں بھی اسی واقعے کا ذکر کیا ہے۔

اور انھی دو دشمنوں کا نام لے کر اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ:

1۔ ان آیات کا فہم چنداں مشکل نہیں تھا۔ اس میں پیچیدگی تب پیدا ہوئی جب انھیں روایات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کے دور میں اس حوالے سے کوئی اختلاف روایت نہیں ہوا۔ قرآن نے اپنے مدعا کو آسان فہم ضرور قرار دیا تھا، لیکن اس کی یہ شرط لگائی تھی کہ اسے عربی مبین اور اس کے داخل سے سمجھا جائے نہ کہ اس کو سمجھنے کے لیے ظنی روایات کا سہارا لیا جائے۔

2۔ جب اسرائیلی روایات بیان کی گئیں تو ان کی روشنی میں آیت کی نحوی ترکیب بدلی گئی اور اس کا نحو کے لحاظ سے متن میں امکان بھی تھا۔ اور جب زبان اور داخلی نظم کے بجاے قرآن کو روایات سے سمجھنے کا چلن ہوا تو طرح طرح کی تاویلات وجود میں آتی گئیں۔

3۔ زمانی لحاظ سے پہلے اسرائیلیات سے ان آیات کو سمجھا گیا، مگر اس کے بعد جب احادیث مدون ہو گئیں تو پھر صحیحین کی روایت سے اس کی تاویل کو وسیع پیمانے پر اختیار کر لیا گیا۔

4۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہوا کہ مسلمانوں کی ساری علمی تاریخ ان آیات کے حقیقی فہم سے بے بہرہ ہو گئی ہو، بلکہ پہلی دو صدیوں میں تو اس حوالے سے کوئی ایسی تفسیر، کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ قرآن نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جسے اس کے اولین مخاطبین ہی نہ سمجھ سکے۔ حقائق اوجھل ہونے کے باوجود امام رازی اور دیگر مفسرین نے ان آیات کا قریب قریب مفہوم سمجھ لیا تھا۔ غیر عقلی اور غیر حقیقی روایات کا شدت سے رد کیا، مگر قرآن کو داخل سے سمجھنے کی روایت کمزور پڑنے سے وہ بعض حقائق متعین نہ کر سکے۔

5۔ یہ مقدمہ بھی حقیقت کے خلاف ہے کہ دور جدید کے مفسرین نے ان آیات کو من مانی تاویلات سے سمجھنے کی کوشش کی، بلکہ انھوں نے زبان و بیان کے مسلمات سے اس کا مفہوم متعین کیا اور پھر تاریخ کی واضح شہادت سے اسے موکد کیا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو مخالف ضرور اس کا تذکرہ کرتے، لیکن وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکے کہ ”جسداً“ کا حال ہونا نحوی اعتبار سے بالکل درست ہے اور قرآن کے داخلی متن کی شہادت اور تاریخ کی گواہی اسی تفسیر کے حق میں ہے۔

اصل حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن مجید کو اس کے داخلی نظائر، اس وقت کی زبان و اسلوب اور

اس کے نظم سے سمجھنا کوئی اجنبی طریقہ نہیں، بلکہ دنیا کی ہر کتاب کو اسی طریقے سے سمجھا جاتا ہے۔ اور قرآن کو اگر کوئی عالم اس طریقے سے سمجھتا ہے تو وہ اسے اس کے اولین مخاطبین کے طریقے پر سمجھ رہا ہے۔ اور یہ قرآن کو اس دور میں لے جا کر سمجھنا ہے جس دور میں وہ نازل ہوا تھا نہ کہ کسی اجنبی اور جدید دور میں۔

حسان عارف

علامہ شبلی نعمانی اور امام حمید الدین فراہی پر فتوائے تکفیر

عطیہ فیضی معروف دانش ور تھیں۔ ممبئی کے ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ پہلی ہندوستانی خاتون تھیں جنھوں نے انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ علوم وفنون کی شیدائی تھیں۔ علامہ شبلی رحمہ اللہ کی علمی وسعتوں اور علامہ اقبال رحمہ اللہ کے شعر وادب کی فدائی تھیں۔ اس دور کا ایک نام ور یہودی آرٹسٹ سیموئل رہامین عطیہ فیضی پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے عطیہ سے التجا کی کہ آپ مجھ سے شادی کر کے میری رفیقۂ حیات بن جایئے۔ یہ بات سن کر عطیہ چونک اٹھیں۔ انھوں نے رہامین سے کہا: میں مسلمان ہوں، تم کافر ہو، میرا تمھارا کیا جوڑ؟ میں تو تم سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ رہامین نے تڑپ کر جواب دیا کہ میں آج اور ابھی یہودیت کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہتا ہوں اور نہایت خوش دلی سے اسی وقت اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہوں... رہامین کے مسلمان ہو جانے اور عطیہ فیضی سے شادی کر لینے کی خبر علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے سنی تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ انھوں نے معاً یہ شعر کہا اور یہی شعر ان کا وثیقۂ شادمانی بن گیا۔

بتان ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

علامہ شبلی رحمہ اللہ کے جذبۂ ایمانی کا تو یہ حال تھا کہ کسی کافر کے مسلمان ہو جانے پر پھولے نہ سماتے تھے، لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ بعض علماے ہند خود انھی کی تصانیف ''الکلام'' اور ''علم الکلام'' کو تحریف کی باڑھ پر رکھ کر انھی پر تیغ تکفیر چلا دیں گے اور اس کی لپیٹ میں قرآنی علوم کے ماہر اجل اور تقویٰ و پرہیز گاری کے نادر روزگار نمونہ و نمایندہ امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

کو بھی لے لیں گے۔

ملال یہ ہے کہ علامہ شبلی رحمہ اللہ اور حضرت فراہی رحمہ اللہ کے خلاف 32 صفحات پر مشتمل کفر کے فتوے پر دستخط کرنے والے علما میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہا اللہ بھی شامل تھے، تاہم بعد ازاں حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور دیگر فہیم علما نے اپنا سقم فہم محسوس کر کے اس فتوے سے رجوع فرمانے کا اعلان کر دیا۔

ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ گو علامہ شبلی اور امام فراہی رحمہما اللہ کے خلاف کفر کا یہ فتویٰ کار بے خیر سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ یہ فتویٰ باد صرصر کے جھونکے کی طرح آیا اور وقت کی گردشوں میں نابود ہو گیا۔ لیکن اس فتوے کے رد میں علماے حق نے جو گراں مایہ تحریریں سپرد قلم کیں ان سے نہ صرف علوم عظیمہ عیاں ہو کر سامنے آئے، بلکہ کفر و ایمان کا فرق بھی پوری وضاحت سے عیاں ہو گیا۔

گڑے مردے اکھاڑنا اچھی بات نہیں، مگر حقیقت سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ علامہ شبلی رحمہ اللہ کے خلاف جن عبارات و ملفوظات کو بنیاد بنا کر تکفیر کی جو تیغ بے دریغ چلائی گئی اس کا جائزہ ہم بعد میں لیں گے۔ سر دست ہم استاذ العلما امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کا ماجرا سناتے ہیں کہ بعض اصحاب غرض علما نے انھیں کس خطا پر ہدف کفر بنایا فی الحقیقت ان کی خطا یہ تھی۔

اس خطا پر انھیں مارا کہ خطاوار نہ تھے

بعض لوگ بڑی آسانی سے مسلمان کو کافر کہہ دیتے ہیں۔ کافر بڑا سخت لفظ ہے حالانکہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کہنا، کسی کافر کو مسلمان کہنے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ ہم نے آج کل یہ طریقہ اختیار کیا ہوا ہے کہ اپنا جو ایک مسلک قرار دے لیا ہے بس وہی اسلام ہے۔ جو اس کے خلاف ہو، وہ کافر ہے اور ایمان سے خارج ہے۔

کفر کیا چیز ہے؟ اور کافر کسے کہتے ہیں؟ اہل لغت نے کفر کے متعدد معنی لکھے ہیں مثلاً: چھپانا، اندھیرا چھانا، ناشکری کرنا، معاف کر دینا، گناہوں کا کفارہ ادا کرنا، توحید، نبوت یا شریعت کا انکار کرنا یا تینوں کا انکار کرنا۔ ان تمام معنی پر غور کیجیے تو پتا چلے گا کہ ''کفر'' کے اندر چھپانے کا معنی قدر مشترک اور جوہری حیثیت کا حامل ہے۔ یہ بات صراحت سے جان لینی چاہیے ''کفر'' کا اصل مطلب ہے ''چھپانا''۔ عرب حضرات اکثر اوقات کسانوں کو کافر کے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں،

اس لیے کہ کسان بیج کو زمین میں چھپا دیتے ہیں۔ شرعی لحاظ سے دین حنیف کی (بنیادوں) میں سے کسی بھی چیز کا انکار کفر ہے اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے علاوہ کسی بھی دوسرے مذہب کا پیروکار صریحاً کافر ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد جن مسلمانوں نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کیا تھا، خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے اسی طرح جنگ کی تھی جس طرح کافروں سے جہاد کیا جاتا ہے۔ کافر در اصل اسی کو کہتے ہیں جو دل اور (زبان) سے منکر حق ہو اور جو شخص زبان سے اللہ رب العزت کی ذات عالی کا انکار کرے وہ بھی کافر ہے کیونکہ اس کی زبان ہی اس کے دل کی ترجمان ہے۔

بیسویں صدی میں اسلامی دنیا نے جن بڑی علمی ہستیوں کو پیدا کیا، ان میں سے ایک نام امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کا ہے۔ ان کی نکتہ رسی، دقیقہ سنجی، ناقدانہ رائے، محققانہ طرز فکر کا ایک زمانہ معترف ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ وہ بیک وقت عربی کے سوق عکاظ، فارسی کے بلبل شیراز بھی تھے۔ علوم عربیہ کے خزینہ اور فنون ادبیہ کے ناقد بھی۔ وہ اپنے وقت کے رازی بھی تھے، غزالی بھی، ابن تیمیہ بھی تھے، زمخشری بھی۔

امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے ایسا کون سا غضب ڈھا دیا تھا کہ بعض علما انھیں دائرۂ اسلام ہی سے خارج کرنے کے درپے ہو گئے؟ اس کا سبب تکفیر سازی پر تلے ہوئے مدعیان علم نے حضرت فراہی رحمہ اللہ کے ایک ناتمام مضمون کو ٹھہرایا جو انھوں نے اپنی نجی یادداشت کے لیے بہ طور اشاریہ لکھا تھا۔ امام فراہی رحمہ اللہ اس مضمون کے ذریعے سے ترجمۂ قرآن کی مشکلات سامنے لانا چاہتے تھے۔ یہ مضمون امام فراہی رحمہ اللہ کی نجی یادداشت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اشاعت کے لیے نہیں لکھا گیا تھا، اس لیے نہ تو مکمل تھا نہ اس میں ادب و انشا اور ترتیب و تہذیب کا وہ اہتمام و التزام تھا جو پبلک تحریروں کے لیے عموماً ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس مضمون کی ایک ایک سطر پڑھیں تو پورا مضمون قرآن کی عظمت و جلالت سے لبریز ہے۔

ماہنامہ ''الاصلاح'' مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہوتا تھا۔ یہ اپنے طرز کا ایک منفرد رسالہ تھا جس میں نہایت بلند پایہ اور معیاری و مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کی خصوصیت امام فراہی رحمہ اللہ کے افکار و خیالات کی اشاعت بھی تھی۔ امام فراہی رحمہ اللہ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اس کے مدیر تھے۔ مولانا

اصلاحی رحمہ اللہ نے امام فراہی رحمہ اللہ کی نا تمام نجی یادداشتیں فروری 1936 کے ''الاصلاح'' میں ''خیالات اثنائے ترجمۂ قرآن'' کے عنوان سے شائع کر دیں اور اس پر بغرض انتباہ ایک نوٹ لکھ دیا کہ یہ ''مضمون نا تمام حالت میں ہے، اس لیے کہیں کہیں عبارت چھوٹی ہوئی ہے، بعض جگہ سخت ابہام ہے۔ ناظرین غور سے ملاحظہ فرمائیں۔'' اس انتباہ کا تقاضا تھا کہ لوگ قرآن مجید کے ترجمے کے وقت اس مضمون کے بیش قیمت مطالب سے استفادہ کرتے، جو بات سمجھ میں نہ آتی اسے چھوڑ جاتے کہ یہ تحریر نا تمام ہے۔ اگر الفاظ و عبارت میں کوئی سقم نظر آتا، اس سے در گزر کرتے کہ یہ مصنف کی نظر ثانی اور حک و اصلاح کی محتاج ہے۔

امام فراہی رحمہ اللہ کے اس مضمون میں سے دو باتیں لے کر اور علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کی کتابوں ''الکلام'' اور ''علم الکلام'' میں سے بعض اقتباسات دے کر بعض مولویوں نے 32 صفحات پر مشتمل تکفیر کا فتویٰ شائع کر دیا اور اسی لپیٹ میں مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ، طلبہ، کارکنوں کو کافر بنا ڈالا۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ بات مان لی جائے کہ علامہ شبلی اور امام فراہی رحمہما اللہ (العیاذ باللہ) کافر ہیں، لیکن مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ اور اس کے تمام متعلقین کیسے کافر ہو گئے؟ اس سوال کا جواب فتویٰ میں یہ دیا گیا کہ مدرسۃ الاصلاح کے علما و اساتذہ اس لیے کافر ہیں کہ وہ مولانا شبلی اور امام فراہی رحمہما اللہ کو بزرگ و محترم سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ان دونوں کافروں سے اپنی نفرت و بیزاری کا اعلان کر دیں تو یہ مفتیان دین ان لوگوں کو پھر اسلام و ایمان کے حلقے میں لے لیں گے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ مفتیان دین نے مدرسۃ الاصلاح کے علما و اساتذہ کی نجات کے لیے ایک دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔

فتویٰ میں علامہ شبلی رحمہ اللہ کی تحریروں میں سے جو اقتباسات دیے گئے، وہ تمام تر فریب کاری اور بد دیانتی پر مشتمل تھے۔ علامہ شبلی رحمہ اللہ منکرین خدا کے دلائل نقل کر رہے ہیں، فتویٰ میں وہ ان کے عقائد کی حیثیت سے پیش کیے گئے۔ علامہ شبلی رحمہ اللہ دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں، وہ ان کے ذاتی خیالات قرار دیے گئے۔ بعض جگہ علی سبیل التنزل (بطریق فرض) حریف کا کوئی دعویٰ تسلیم کر کے اس کی تردید کر رہے ہیں، اس کو ان کا مسلک بتا کر پیش کیا گیا۔ غرض تمام عبارتیں سیاق و سباق سے چھین کر، پوری بے دردی سے مسخ کر کے، مفتیوں کے سامنے رکھ دی گئیں کہ وہ کسی طرح اس شخص کو کافر بنا دیں جو ''الکلام'' اور ''علم الکلام'' ہی کا مصنف

نہیں ہے، ''الفاروق'' اور ''سیرۃ النبی'' کا بھی مصنف ہے اور ان بے درد مفتیوں نے پوری بے باکی سے علم و تحقیق کی گردن پر ہمیشہ کے لیے چھری چلا دی۔

امام فراہی رحمہ اللہ کی فرد قرار داد جرم کے لیے مصالحہ، امام رحمہ اللہ کی اس ناتمام یادداشت سے فراہم کیا گیا جو ''الاصلاح'' میں ''اثنائے ترجمۂ قرآن'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس مضمون میں دو باتیں تکفیر کا باعث سمجھی گئیں حالانکہ ان دو میں سے ایک بھی تکفیر کی مستوجب نہیں تھی۔ ان یادداشتوں میں ایک بات یہ بھی کہی گئی تھی کہ قرآن کریم میں کہیں کہیں قافیے کی رعایت اور عبارت کی روانی کا لحاظ کر کے مروجہ اصول نحو کی پیروی نہیں کی گئی یا الفاظ آگے پیچھے کیے گئے ہیں۔ امام فراہی رحمہ اللہ زور دیتے تھے کہ جہاں بھی ایسا ہوا ہے، ترجمے میں بھی قرآن کریم کی اسی طرح پیروی کی جائے اور لفظ کو آگے پیچھے سے ہٹایا نہ جائے۔ ان یادداشتوں میں ایک اہم بات یہ بھی سامنے آئی کہ بہت سے لوگ قرآن کریم کی ہر سورت پر مسلسل و مربوط اور متحد المقصد مضمون کی حیثیت سے غور کرنا چاہتے ہیں۔ مزید برآں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر سورت کا جو عنوان ہے، وہی اس سورت کا موضوع ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں آدمی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ اصل حقیقت جب کہ یہ ہے کہ سورتوں کے عنوانات کا سورتوں کے موضوع اور مطلب سے کوئی تعلق نہیں۔ سورتوں کے یہ عنوانات صرف سورتوں کے امتیاز کے لیے کسی خاص لفظ کی مناسبت سے رکھ دیے گئے ہیں۔ یہی مذاق عرب تھا جس کی پیروی سورتوں کے عنوانات رکھنے میں روا رکھی گئی ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں پاروں اور رکوعوں کی تقسیم ہے۔ اس تقسیم سے جو طالبان علم یہ سمجھتے ہیں کہ اس پارہ یا رکوع پر مضمون ختم ہو گیا ہے اور دوسرے پارے یا رکوع سے دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے، ان کا یہ سمجھنا ٹھیک نہیں کیونکہ قرآن کریم 30 پاروں میں تقسیم ہے۔ رکوع دس دس آیتوں کا ایک ایک حصہ ہے۔ یہ معنوی تقسیم نہیں ہے، بلکہ لفظی تقسیم ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عام لوگ نماز میں آسانی سے قرآن کریم کا ایک مناسب حصہ پڑھ سکیں۔ امام فراہی رحمہ اللہ کی یاد داشتوں کے بہت سے مضامین اسی طرح کے علمی موضوعات سے تعلق رکھتے تھے۔ اس مضمون کو سمجھنے میں بعض مدعیان علم کو سخت ٹھوکر لگی۔ علامہ شبلی اور امام فراہی رحمہما اللہ کے مضامین کی تشریحات کے لیے ''الاصلاح'' میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا بدرالدین

اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی اور مولانا امین احسن اصلاحی رحمہم اللہ کے مضامین شائع ہوئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ نے اپنے رسالے ''صدق'' میں بڑی تفصیل سے لکھا۔ علامہ شبلی اور امام فراہی رحمہما اللہ کے خلاف فتویٰ دینے والے حضرات کی نسبت بعض علماے کرام نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ ان حضرات نے امام فراہی رحمہ اللہ کے مضامین کے سیاق وسباق کی عبارتوں پر غور ہی نہیں کیا۔ اگر وہ سیاق وسباق کے متن پر دھیان دیتے تو انھیں بعض الفاظ پر خلجان میں مبتلا ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔

علامہ شبلی اور امام فراہی رحمہما اللہ کے خلاف کفر کے فتوے کا شور مچا تو تمام اسلامیان ہند سناٹے میں آ گئے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ دیوبندی علما کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح تشریف لائے۔ دیوبند کے وفد کی آمد پر مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے نعرہ لگایا:

بیاورید گر ایں جا بود سخن دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مدرسے میں مولانا مدنی رحمہ اللہ کا وعظ ہوا۔ انھوں نے مدرسۃ الاصلاح کی خدمات کو نہایت حوصلہ افزا الفاظ میں سراہا۔ مدرسے کے طلبہ، اساتذہ، کارکنوں اور عام حاضرین جلسہ کو نصیحتیں فرمائیں اور مشورے دیے۔ علامہ شبلی اور امام فراہی رحمہما اللہ کی تحریروں کے متعلق اپنی راے قلم بند فرما دی جو ''الاصلاح'' میں شائع ہوئی، حضرت مدنی رحمہ اللہ کے خطوط کا مجموعہ ''مکتوبات شیخ الاسلام'' کے عنوان سے چار جلدوں میں شائع ہوا جسے مولانا نجم الدین اصلاحی رحمہ اللہ نے مرتب کیا اور یہ مجموعہ مولانا مدنی رحمہ اللہ کی زندگی میں شائع ہوا۔ ایک خط میں مسئلۂ تکفیر کے سلسلے میں مولانا مدنی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''... آپ حضرات کے جوابات دیکھ کر مجھے کلی اطمینان ہو گیا ہے اور جو شکوک و شبہات مجھے مولوی محمد فاروق صاحب کے کھلے مفروضے کو دیکھنے اور دیگر حضرات کے کلمات کی بنا پر پیدا ہوئے تھے، وہ سب رفع ہو گئے۔ مجھے سخت تعجب ہے کہ ان حضرات نے ایسے سخت گزار خطرناک راستے یعنی تکفیر مومنین کو کیوں اختیار فرمایا ہے، حالانکہ اس کے مماثل امور کے لیے نہایت شدید وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ کیا آپس کے نزاعات نفسانیہ اس کی اجازت دیتے ہیں کہ افتراءات اور بہتانوں کا طومار باندھ کر تکفیر کے فتاویٰ حاصل کیے جائیں؟ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے ”الاصلاح“ کے پرچے دیکھے، مجھ کو ان میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس کا کوئی صحیح حل نہ ہو سکتا ہو...۔“(مکتوبات شیخ الاسلام 2/320-319)

مولانا نجم الدین اصلاحی رحمہ اللہ حضرت مدنی رحمہ اللہ کے اس مکتوب کو نقل کرنے کے بعد حاشیے میں لکھتے ہیں:

”شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ کے اس قول فیصل نے قبر تکفیر کے ایک ایک ستون اور ایک ایک اینٹ کو منتشر کر دیا، غوغاے تکفیر اور کافر گری کا ناس ہو گیا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ اور دیگر مفتیان ہند نے بعض تشریحی مضامین پڑھے اور مولانا مدنی کے محاکمہ پر تکفیر سے رجوع کر لیا۔“

(مکتوبات شیخ الاسلام 2/320-319)

مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہ اللہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے مقربین میں سے تھے۔ مشہور مفسر، مقالہ نویس اور ماہنامہ ”صدق“ کے مدیر تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے انھیں ایک خط لکھا۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”مولانا تھانوی کا فتویٰ شائع ہو گیا۔ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی کافر ہیں۔ اور چونکہ مدرسہ ان ہی دونوں کا مشن ہے، اس لیے مدرسۃ الاصلاح مدرسۂ کفر و زندقہ ہے اور اس کے تمام متعلقین کافر و زندیق ہیں، یہاں تک کہ جو علما اس مدرسے کے جلسوں میں شرکت کریں، وہ بھی ملحد و بے دین ہیں۔ افسوس کہ اصل فتویٰ نہ مل سکا۔ مل جاتا تو اصل یا نقل آپ کی خدمت میں بھیج دیتا۔ عام مولویوں کی شکایت فضول ہے۔ ان سے توقع ہی کسے تھی، البتہ بڑی مایوسی مولانا تھانوی سے ہوئی۔ جن دو عبارتوں پر مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تکفیر کی گئی ہے ہر چند کہ میرے نزدیک وہ بالکل واضح ہیں، تاہم آپ کی ہدایت کی تعمیل میں ان دونوں کی تشریح جون کے پرچے الاصلاح میں چھپ گئی ہے۔“

(حکیم الامت از مولانا عبد الماجد دریابادی 418)

مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہ اللہ نے مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کا خط موصول ہونے کے بعد ایک مفصل خط مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کو لکھا۔ انھوں نے علامہ شبلی اور امام فراہی رحمہما اللہ کے بارے میں لکھا کہ ایسے لوگوں کے خلاف کفر کا فتویٰ حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ مولانا

تھانوی رحمہ اللہ نے خط کا جواب دیا اور فتویٰ سے رجوع کرنے کے بارے میں بتایا۔ مولانا دریا بادی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''حکیم الامت'' میں پوری روداد شامل کی۔ اس میں انھوں نے شبلی و فراہی رحمہا اللہ کے بارے میں مولانا تھانوی رحمہ اللہ کا ذہن صاف کرنے اور رجوع کرانے کا سہرا اپنے سر باندھا ہے۔ ممکن ہے دونوں بزرگوں مولانا مدنی اور مولانا دریا بادی رحمہا اللہ نے اپنے اپنے طور پر حق ادا کیا ہو۔

یہ فتویٰ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ کی نظر سے گزرا تو انھیں بے حد ملال ہوا۔ انھوں نے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''مولانا حمید الدین فراہی مرحوم جن کی عبارت پر یہ ہنگامہ بپا کیا گیا ہے، ان علماے حق میں سے تھے جن کا سرمایۂ امتیاز صرف علم ہی نہیں عمل بھی ہوتا ہے اور اس دوسری جنس کی کم یابی کا جو عالم ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ میں جب کبھی ان سے ملا، مجھ پر ان کے علم سے زیادہ ان کی عملی پاکی کا اثر ہوا۔ وہ پورے معنوں میں ایک متقی اور راست باز انسان تھے۔ ان کے دل کی پاکی اور نفس کی طہارت دیکھ کر رشک ہوتا تھا۔''

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نہ صرف علم و فضل میں یکتاے زمانہ تھے، بلکہ اپنی صحت اعتقاد اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے خواص امت میں سے تھے۔''

یہ فتویٰ افسوس ناک ہی نہیں، علما کے لیے باعث شرم بھی تھا۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے اس کی کھل کر مخالفت کی۔ آپ نے ''ترجمان القرآن'' (جولائی 1936) میں تحریر کیا:

''مومن کو کافر کہنے میں اتنی ہی احتیاط کرنی چاہیے، جتنی کسی شخص کے قتل کا فتویٰ صادر کرنے میں کی جاتی ہے، بلکہ یہ معاملہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کسی کو قتل کرنے سے کفر میں مبتلا ہونے کا خوف تو نہیں ہے، مگر مومن کو کافر کہنے میں یہ خوف بھی ہے کہ اگر فی الواقع وہ شخص کافر نہیں ہے اور اس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان موجود ہے تو کفر کی تہمت خود اپنے اوپر پلٹ آئے گی۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہو، اور جس کو اس کا کچھ بھی احساس ہو، وہ کبھی کسی مسلم کی تکفیر کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جو شخص مسلمان کی تکفیر کرتا ہے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی اس رسی پر قینچی چلاتا ہے جس کے ذریعے سے مسلمانوں کو جوڑ

کر ایک قوم بنایا گیا ہے۔ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماے دین میں کافروں کو مسلمان بنانے کا اتنا ذوق نہیں، جتنا مسلمانوں کو کافر بنانے کا ذوق ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ ''الاصلاح'' (ستمبر 1936) میں لکھتے ہیں:

''یہ کس قدر درد انگیز حالت ہے کہ ہمارے علما نے اپنی بے احتیاطی سے اپنی سب سے بڑی طاقت بالکل کھو دی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے صحابہ رضی اللہ عنہم جس سے آنکھیں پھیر لیتے تھے، اس سے آسمان وزمین آنکھیں پھیر لیتے تھے۔ احادیث وسیر میں نہ جانے کتنے واقعات اس قسم کے مذکور ہیں۔ اور ایک یہ زمانہ ہے کہ ہمارے علما کے تکفیر کے فتووں پر لوگ ہنستے ہیں اور جن کی تکفیر کی جاتی ہے انھیں مبارک باد دیتے ہیں۔ ہم اس معاملے کو صرف شخصی پہلو سے نہیں دیکھتے، بلکہ اس کے اجتماعی انجام پر بھی غور کرتے ہیں اور اس انقلابی حالت پر بڑا رنج ہوتا ہے۔ ہماری یہ خواہش نہیں ہے کہ فتویٰ نویسی یوں بے وقعت ہو جائے، بلکہ ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ علما اپنے صحیح منصب کو حاصل کریں اور مسلمانوں میں فتویٰ نویسی کا صحیح وقار قائم ہو۔ لیکن جو لوگ ابھی مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کے کفر وایمان کا فیصلہ نہیں کر سکے، ان سے آیندہ کیا امیدیں کی جا سکتی ہیں؟ اس وقت اس مسئلے سے متعلق کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان شاء اللہ کسی آیندہ فرصت میں، ہم کتاب و سنت کی روشنی میں فتویٰ نویسی اور اس کے لوازم وشرائط پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ فی الحال صرف اتنا عرض کریں گے کہ علما خود کو عدالت الٰہیہ کا ترجمان سمجھیں اور جو کچھ کہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول کی سنت کی روشنی میں کہیں۔ خدا نے قرآن اور رسول کو حکم ٹھہرایا ہے۔ عالمگیریہ اور تارخانیہ کی پیروی کا حکم نہیں دیا ہے۔''

الحمد للہ، بعد ازاں مولانا تھانوی رحمہ اللہ اور فتویٰ پر دستخط کرنے والے دیگر علما نے اپنا سقم فہم محسوس کر کے فتویٰ سے رجوع کر لیا۔ امام حمید الدین فراہی اور علامہ شبلی رحمہما اللہ جوار رحمت الٰہی میں پہنچ چکے اور ان کا معاملہ اس کی عدالت کے سپرد ہے جو دلوں کے بھید اور نیتوں کے اسرار و خفایا کو اچھی طرح جانتا ہے اور احکم الحاکمین ہے۔

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

ڈاکٹر عرفان شہزاد

جبری تعلیم

صنعتی دور اور قومی ریاستوں کی تشکیل کے زمانے میں تعلیم کا حصول ہر فرد کا مسئلہ بنا دیا گیا تاکہ صنعت اور ریاست کو مطلوبہ افرادی قوت میسر آ ہو سکے۔ دور جدید کا یہ ایک غیر متوازن رجحان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد تعلیمی رجحان کا حامل نہیں ہوتا۔ تعلیم پر بھرپور وسائل خرچ کرنے والے ممالک میں بھی یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ ہر بچے کو رسمی تعلیم کے ذریعے سے تعلیم یافتہ بنایا جا سکے۔ فطری رجحانات کو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

جس طرح تعلیمی رجحان رکھنے والے بچوں کو تعلیم کے بجائے کسی کام، دھندے یا ہنر سیکھنے پر لگا دینا ظلم ہے، اسی طرح تعلیمی رجحان نہ رکھنے والے بچوں کو حصول تعلیم پر مجبور کرنا بھی زیادتی ہے۔ ایسے بچے موافق حالات اور وسائل کے باوجود بھی پڑھنے کی طرف مائل نہیں ہو پاتے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی تعلیمی رجحان کی کمی کوئی بری چیز ہے۔ کم تعلیمی رجحان رکھنے والے بچے ہم نصابی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے پائے جاتے ہیں۔ کچھ بچے تکنیکی ذہن رکھتے ہیں، چیزوں کو کھولنے جوڑنے میں ہوشیار ہوتے ہیں۔ بعض کھیل کود میں بہت مہارت دکھاتے ہیں، کچھ کھیتی باڑی یا جانور وغیرہ پالنے میں دل چسپی رکھتے ہیں، بعض کاروباری صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ لڑکیوں میں یہ رجحانات گھر داری، تصویر کشی، فیشن ڈیزائننگ یا بیوٹیشن وغیرہ کی ہنر مندیوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ان بچوں کو اگر ان کے طبعی رجحان کے مطابق آگے بڑھنے دیا جائے تو اکثر اپنے طبعی میدانِ عمل

میں بہت کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر رائج نظام تعلیم میں ہر بچے کو کم از کم دس بارہ سال رسمی تعلیم کی چکی میں پیسنا ضروری سمجھا گیا ہے، حتیٰ کہ غیر تعلیمی شعبہ جات کی ملازمتوں کے لیے بھی کم سے کم معیارِ تعلیم میٹرک رکھا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک بچہ اگر تعلیمی رجحان نہ رکھتا ہو تو اسے بھی ایک ادنیٰ ملازمت کے لیے دس بارہ سال ناچاہی تعلیم کی مشقت میں بسر کرنا ہوتے ہیں۔ ایک ناگوار کام مسلسل دس بارہ سال کرتے رہنے کی اذیت سے انسانی دماغ اور نفسیات پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کا احساس تک موجود نہیں۔

ایسے ہنر مند افراد کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں جو اس تعلیمی چکر میں پڑے بغیر اپنی مرضی کا ہنر سیکھ کر اپنے شعبے میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ پیشہ یا ہنر سیکھنے کے لیے دس بارہ سال کی عمومی رسمی تعلیم کی پابندی غیر ضروری ہے، نہ صرف غیر ضروری ہے، بلکہ تعلیمی رجحان سے عاری بچوں کے لیے بڑی تکلیف اور نقصانات کا باعث ہے۔

جبری تعلیم سے بچنے کے لیے ایسے بچے جب ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں تو نکمے اور باغی کہلاتے اور اپنی نظر میں بھی مجرم بنا دیے جاتے ہیں اور یوں وہ منفی نفسیات کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ایسے بچوں کو زبردستی تعلیم دلا بھی دی جائے تو بہت محنت کے بعد بھی معمولی کارکردگی ہی دکھا پاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ معمولی تعلیم کی وجہ سے کوئی ڈھنگ کی ملازمت پانے میں بھی ناکام رہتے ہیں اور اپنے طبعی ٹیلنٹ کو برتنے کی مسرت اور اس کے ذریعے سے ممکنہ کامیابی سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

ایسے تعلیم بیزار طلبہ امدادی کتب سے تیاری کرتے، اسائنمنٹس کاپی کرتے، امتحانات میں نقل کرتے اور شارٹ کٹس کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اور کم گریڈز کی وجہ سے مغموم اور شاکی بھی رہتے ہیں۔ اساتذہ اور اداروں کے قیمتی وقت اور وسائل کا بہت بڑا حصہ ان طلبہ کے تعلیمی نقائص دور کرنے اور سرقے (Plagiarism) کے حیلوں سے نمٹنے پر لگتا ہے، مگر اس میں کامیابی پھر بھی نہیں ملتی۔ ڈگری کی مجبوری ختم کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ کتنے افراد تعلیم کی کٹھنائیوں میں شامل ہونا پسند کریں گے۔

ایسے طلبہ رسمی تعلیم سے ہٹ کر دیگر کاموں کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اگر یہ اپنا قیمتی وقت درست مصرف میں لگائیں تو رسمی تعلیم کے حصول کی ذہنی اذیت سے بھی بچیں گے اور پیشہ ورانہ

زندگی میں بہت جلد مناسب مقام بھی حاصل کر پائیں گے۔

پیشہ ورانہ تعلیم یا ہنر سیکھنا ہمارے ہاں ثانوی اہمیت کا حامل ہے۔ سائنسز اور پھر سوشل سائنسز کی تعلیم ہی اولین ترجیح ہے۔ ان مضامین میں بہتر کارکردگی نہ دکھا سکنے پر طلبا کو جب پیشہ ورانہ تعلیم یا کاروبار کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے، تب تک بچے کا بہت وقت ضائع ہو چکا ہوتا ہے۔

ابتدائی تعلیم کے دوران ہی میں بچے کے رجحانات دیکھ کر اس کا فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اسے مزید تعلیم دلانی ہے تو کس قسم کی تعلیم اس کے طبعی رجحان کے مطابق مفید رہے گی اور اگر تعلیم اس کا میدان ہی نہیں تو پھر کون سا شعبۂ زندگی یا ہنر اس کے لیے بہتر رہے گا۔

دور جدید سے پہلے، تعلیم ہمیشہ سے متوسط طبقے کا مسئلہ اور میدان رہا تھا، اشرافیہ اور غربا بطور طبقہ باقاعدہ رسمی تعلیم حاصل نہیں کیا کرتے تھے۔ البتہ تعلیمی ذوق رکھنے والے افراد حصولِ تعلیم کا اہتمام انفرادی طور پر کیا کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کا دربار علم و ہنر میں یکتا نورتنوں سے سجتا تھا، مگر اس رونق افروزی کے لیے خود اکبر کا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہ تھا۔ اشرافیہ اپنے وسائل سے وہ میدان سجاتے ہیں جہاں ہنر مند، تعلیم یافتہ متوسط طبقہ اپنے علم و ہنر سے سماج کو مستفید کرتا ہے۔ اشرافیہ کے لیے ڈگری اہم نہیں ہوتی اور ملازمت اختیار کرنا بھی عموماً وہ پسند نہیں کرتے۔ لیکن سماج میں عزت اور معاش کو رسمی تعلیم سے منسلک کر دینے کے بعد اشرافیہ اور غربا بھی تعلیم کے حصول کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ یوں قومی وسائل پر بے جا بوجھ میں اضافہ ہوا۔

تعلیمی اسناد کے حصول کی دوڑ میں سب سے بڑا نقصان غریب کا ہوا۔ وہ اس کوشش میں رہا کہ اس کا بچہ پڑھ لکھ کر اچھا کمانے کے قابل ہو جائے اور سماج میں عزت بھی مل جائے۔ اسی کوشش میں وہ اپنے تمام وسائل بچوں کی تعلیم میں جھونک دیتا ہے، مگر معیاری تعلیم پھر بھی نہیں دلوا سکتا۔ کسی نمایاں کامیابی کے لیے اس کے بچے کا نہ صرف غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری ہے، بلکہ خوش قسمت ہونا بھی لازم ہے اور ایسے کتنے ہوتے ہیں؟ میٹرک، ایف اے یا بی اے کرنے کے بعد غریب کا بچہ اب چھابہ لگانا بھی پسند نہیں کرتا اور نہ کسی دکان پر بیٹھنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ دفتری ملازمت کا خواب تمام عمر ایک ناتمام حسرت بن کر اسے کچوکے لگاتا رہتا ہے۔

حصول تعلیم کی پابندی اچھے کاروباری خاندان کے بچوں کے لیے بھی بعض اوقات ناگوار صورتِ حال کا باعث بنتی ہے۔ تعلیم کے حصول کے بعد جب وہ ملازمت اختیار کرتے ہیں تو

کاروباری آمدنی کے مقابلے میں اپنی کم تر آمدنی والی ملازمت سے بد مزا ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر کاروبار کی طرف رخ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر ہو چکی۔

ایک اچھا کاروباری ذہن عموماً تعلیم میں بہت اچھا نہیں دیکھا گیا اور اچھی تعلیمی کارکردگی دکھانے والے اکثر اچھا کاروباری ذہن نہیں رکھتے۔

یہ بھی ایک غلط فہمی ہے کہ تعلیم سے فرد کے سماجی اور سیاسی شعور میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، دیکھا گیا ہے کہ تعلیمی مصروفیات کی زیادتی بچوں کو عملی سمجھ بوجھ سے محروم کرنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ جو بچے تعلیم کی طرف کم رجحان رکھتے ہیں، عملی سمجھ بوجھ میں اکثر فائق نظر آتے ہیں۔ شعور علم اور تجربہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیے رسمی تعلیم لازم نہیں ہوتی، خصوصاً طبعی سائنس کی تعلیم کا شعور کے اضافے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ سماجیات، بشریات اور تاریخ کے علوم اگر عملی زندگی سے متعلق کر کے پڑھائے جائیں تو شعور کی آب یاری میں معاون ہوتے ہیں۔

مسلمانوں میں ”تعلیم سب کے لیے“ کی غلط فہمی کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک روایت سے بھی کی جاتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی دین کا ابلاغ تھا، اور آپ کے بیان میں علم سے مراد دین کا علم ہوتا ہے۔ دنیوی علوم کی ترغیب کے لیے پیغمبر کو تلقین کی ضرورت نہیں۔ انسان یہ علوم ان ترغیبات کے بغیر بھی اپنی ضروریات کے تحت ہمیشہ سے حاصل کرتا آیا ہے اور کر رہا ہے۔ روایت میں مذکور دین کا علم بھی اتنا ہی حاصل کرنا لازم قرار دیا جا سکتا ہے جو ضروریاتِ دین سے متعلق ہے۔ ہر شخص سے عالم دین بننے کا مطالبہ بھی مراد نہیں ہو سکتا، یہ عملاً ناممکن ہے، نیز خود قرآن مجید نے علم دین کے حصول کے چند لوگوں کے انتخاب کو کافی قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ	”یہ تو ممکن نہیں تھا کہ مسلمان، سب
فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ	کے سب نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں
لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا	نہ ہوا کہ اُن کے ہر گروہ میں سے کچھ
قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ	لوگ نکلتے تاکہ دین میں بصیرت پیدا

یَحْذَرُوْنَ. (التوبہ 9:122)

کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو (اُن کے اِن رویوں پر) خبر دار کرتے، جب اُن کی طرف لوٹتے، اِس لیے کہ وہ خدا کی گرفت سے بچتے؟"

تعلیم اور ڈگری سے سماجی رتبہ (status symbol) کے حصول کے تصور کی نفی ضروری ہے۔ فرد کی عزت اس کے ہنر، خدمات اور کردار کی بنا پر ہونی چاہیے، نہ کہ محض تعلیمی ڈگری کی بنا پر۔ تعلیم اگر صرف وہی افراد حاصل کریں جو پڑھنے لکھنے کا فطری اور طبعی رجحان رکھتے ہیں تو دستیاب محدود وسائل میں یہی بہتر ہے۔

تجویز یہ ہے کہ پرائمری کی سطح کی تعلیم سب بچوں کے لیے لازم ہونی چاہیے تاکہ وہ بنیادی مہارتیں سیکھ لیں۔ اس کے بعد بچوں کا رجحان پرکھنے کا جامع طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ماہرین تعلیم اور ماہرین نفسیات کی خدمات حاصل کی جائیں۔ صرف منتخب بچوں کو ان کے رجحان کے مطابق رسمی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے اگلے مراحل میں بھیجنا چاہیے۔ اس طرح تعلیمی اخراجات میں خاطر خواہ کمی آئے گی اور کم وسائل سے بہتر نتائج حاصل کیے جا سکیں گے۔ دوسری طرف رسمی تعلیم سے باہر ہونے والے بچے اپنے اپنے ٹیلنٹ کے مطابق دیگر پیشوں اور کاروبار میں مشغول ہو کر اپنے اور سماج، دونوں کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ حکومت پر نوکریاں پیدا کرنے کا بوجھ بھی کم ہو جائے گا۔

تعلیم کو سماجیات سے عملاً منسلک ہونا چاہیے تاکہ کتاب اور عملی زندگی میں دوری ختم ہو۔ اس کے لیے نظام تعلیم میں عملی سرگرمیوں اور تعلیمی اداروں کی چار دیواری سے باہر کی دنیا کو بھی نصاب کا حصہ بنانا ضروری ہے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

انسان کے ہاتھوں نے مغز کی باتوں کو کاغذوں پر اتارا پھیلایا، اتنا پھیلایا یا پھیلاتے رہیں گے کہ انطلاطق کے ایک ساحل کو دوسرے ساحل سے ملایا جا سکتا ہے۔ کتنی کتابیں، کتنے رسالے، کتنے اخبارات کہ زمین کے کرہ کو اُس میں اب ہم لپیٹ سکتے ہیں۔ تہوں پر تہیں چڑھا سکتے ہیں اور یقیناً ہماری اور ہمارے ہاتھوں کی انگلیوں کی یہ کمائی پھر بھی بچ جائے گی۔ آخر اُن سیاہیوں کو کون تول سکتا ہے، کاغذ کے اُن دستوں کو کون ناپ سکتا ہے، لکڑی یا لوہے کے اُن ٹکڑوں یا قلموں کو کون گن سکتا ہے جو اب تک اس راہ میں خرچ ہوئے یا آیندہ ہونے والے ہیں۔

لیکن جس نے لکھا اور جس کے لیے لکھا، اُن میں کون ہے جس نے یقین کے ساتھ اُن کو لکھا یا یقین کے ساتھ اُس کو پڑھا۔ برناڈ شا کی تمثیلی حکایات ہوں یا شرلاک ہومز کی اختراعی روایات، ہوشربا کی داستانیں ہوں یا پریم چند اور سدرشن کے افسانے۔ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور ہم سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ کیا لکھنے والے اور پڑھنے والے، دونوں اس یقین کے سوا اپنے اندر کوئی اور یقین رکھتے ہیں؟ مرزا داغ کا قدم اگر سچ کی چٹانوں پر نہ تھا تو تم سے کس نے کہا کہ مسٹر شیکسپیئر کی ٹانگیں بھی ہوا کے سوا کسی اور چیز پر قائم تھیں؟ مورخ خود بھی جانتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے قیاس اور تخمینہ کے سہارے پر لکھتا ہے اور تاریخ کے پڑھنے والے بھی جانتے ہیں کہ اٹکل سے نکالے ہوئے نتیجوں کے سوا تاریخ کی کتابوں میں اور کچھ نہ ملے گا۔

یہ اُن باتوں اور زبان کی درازیوں کا حال ہے جنھیں لکھ کر ہم نے علم کا بھیس عطا کیا ہے۔ لیکن جو واقعی علوم ہیں اور جن کے نتائج پر زندگی کے بے شمار کاروبار چل رہے ہیں، بلاشبہ نتائج تو صحیح ہیں، لیکن ان نتائج کے لیے جن قوانین کو ہمارے دماغ نے اصول کی شکل میں پیش کرنا چاہا ہے، تم نہیں جانتے، لیکن اصول کے جاننے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے بھی ان کو اس حد تک نہیں جانا ہے اور شاید جان بھی نہ سکتے، جس کے بعد علم پر یقین کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس غبی اور غیر فلسفی دماغ کو کون فلسفی کہہ سکتا ہے جو اپنی فلسفیانہ کوششوں میں "شک" اور "ارتیاب"، "تذبذب" اور "دُبدَھا" کے خارستانوں تک نہ پہنچ گیا ہو۔ "شک" ہی کے کانٹے اور "تذبذب" ہی کے انگارے فلسفیانہ محنت کی سب سے بڑی اور یقیناً سب سے بڑی قیمتی مزدوری ہیں۔

سائنس اور ریاضی کے نتائج سے کسے انکار ہے، کون کہتا ہے کہ دن نہیں ہوتا اور رات نہیں آتی، فصلیں نہیں بدلتیں، موسم نہیں پلٹتے، لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے۔ آئن اسٹائن سے پوچھو کہ جن اصولوں سے ان نتائج کو مختلف زبانوں کے مختلف دماغوں نے وابستہ کیا ہے کیا اس کی درستگی پر انھیں یقین نہیں تھا یا اُس پر یقین کے لفظ کے استعمال کا کوئی حق رکھتا ہے۔

امتیں کہتی ہیں کہ آدم زاد کی مذہبی جماعتوں میں غل ہے کہ ان کے پاس یقین ہے۔ نصرانی کہتے ہیں، انجیل یقین ہے، یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ تورات میں اطمینان ہے، ہندوؤں سے سنتا ہوں کہ وید میں یقین ہے۔ علمی ڈگمگاؤ کے لیے گیتا میں قرار ہے کہ یہ علام العیوب کی کتابیں ہیں جو انھیں بھی جانتا ہے جو گزر چکے اور اُن کو بھی جو گزر رہے ہیں اور انھیں بھی جو گزرنے والے ہیں۔ وہ بھی اُس کے سامنے ہیں جو ہمارے سامنے ہیں اور وہ بھی جو ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ ہاں جس کا علم اتنا محیط ہو، کیا شک ہے کہ اسی کی کتاب، اسی کی تصنیف کہہ سکتی ہے کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں ہے، مگر کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ اُن قوموں کے پاس اب وہ کتاب باقی رہ گئی ہے، جسے خدا کے نمایندوں اور رسولوں نے انھیں سپرد کی تھی؟ وید ہو یا اوشا، تورات ہو یا انجیل، تعلیمات یودہ یا تلقینات کنفوشس، کیا کسی کے پاس وہ چیز اپنی اصل شکل میں باقی رہ گئی ہے جس شکل میں انھیں ملی تھی؟ اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی اس پکار سے کانوں میں انگلیاں وہ کیوں ٹھونستے ہیں جو محض اپنی قومی اور ملی انانیت یا خودی کے نشے میں اس حادثہ کو نہیں دیکھنا یا سننا چاہتے ہیں جو خود ان کے ہاتھوں یا ان کے پیشواؤں کے ہاتھوں سے ان کی کتابوں پر گزر گیا۔

خدا کی باتوں میں انسانی خواہش کی خمیر مل گئی ہے، اب اس کو جدا کرنے کی کس میں طاقت ہے؟

پس اب برٹش میوزیم کی طویل الذیل الماریوں، پیرس اور نیویارک کی عظیم الشان لائبریریوں، برلن اور ویانا کے لق و دق کتب خانوں، ہاں مشرق و مغرب کے سارے کتابی ذخیروں کے درمیان زمین کے چہرے پر اگر 'ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ' کا دعویٰ کسی کتاب کے متعلق کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف وہی کتاب ہے جو شاید ہر مسلمان کے "گھر" میں ہے، لیکن غالباً اب کسی کے "اندر" نہیں الا ماشاء اللہ۔

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(2)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

بچپن کی یادوں میں مولانا کو یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے دادا جان انھیں کلرک کی قسم کا بابو بنانا چاہتے تھے۔ انھیں اپنے دادا جان سے اگرچہ بہت محبت تھی، لیکن انھیں کلرک بننا شدید ناپسند تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گھر اور ارد گرد کے ماحول میں اہل علم کے لیے جو قدر و منزلت دیکھتے، وہ اسے پسند کرتے۔ اور ان کے ذہن میں اپنے لیے ایسا ہی کچھ بننے کا خیال پروان چڑھ رہا تھا۔ بتاتے ہیں کہ ہماری برادری مولوی شبلی، مولوی حمید الدین اور مولوی شبلی متکلم کی وجہ سے عالموں کی برادری کہلاتی تھی۔ اور اس وجہ سے ان کا معاشرے میں خاص مقام تھا۔

انھوں نے بتایا کہ وہ جب اسکول آتے جاتے، سعدی کی کریما کے اشعار پڑھتے اور لوگ انھیں توجہ سے سنتے اور ان کی تحسین بھی کرتے اور کچھ لوگ فرمایش کرتے کہ انھیں یہ اشعار سنائے جائیں اور وہ بڑی خوش الحانی سے گانے لگتے:

کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمندِ ہوا
نداریم غیر از تو فریادرس
توئی عاصیاں را خطا بخش و بس
نگہدار ما را ز راہ خطا
خطا در گذار و صَوابم نُما

ترجمہ: اے بخشش فرمانے والے، ہمارے حال پر رحم فرما۔ اس لیے کہ میں حرص کی قید کا قیدی ہوں۔ تیرے سوا ہماری فریاد کو سننے والا کوئی نہیں۔ صرف تو ہی گناہگاروں کی غلطی بخشنے والا ہے۔ ہمیں غلطی کے راستے سے محفوظ رکھ۔ غلطی معاف فرما اور مجھے سیدھا راستہ دکھا۔

لوگ نہ صرف یہ اشعار سنتے، بلکہ ننھے طالب علم کی لَے میں لَے مِلاتے اور ساتھ ساتھ پڑھتے۔

مولانا نے کریما کے ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"ایک عرصہ ہم انھی اشعار کے اسیر رہے، لیکن بڑے ہوئے تو احساس ہوا کہ اس میں تو پورا تصوف در آیا ہے۔"

غالباً مولانا کا اشارہ "اسیر کمند ہوا" کی طرف ہے۔

گاؤں کے ہندوؤں سے تعلق

اس وقت کے سماجی حالات میں مذہبی رواداری کا ذکر کرتے ہوئے مولانا بتاتے ہیں کہ ہم ہندوؤں کی رسومات جیسے شادی بیاہ وغیرہ میں باقاعدگی سے جاتے تھے اور وہ بھی آتے تھے۔ یعنی تہذیبی تعلق پوری طرح قائم تھا۔ مسلمان ان کی خالص مذہبی تقاریب میں نہیں جاتے تھے، لیکن ہندو بقر عید پر بھی آتے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کی طرح وہ اچھا لباس بھی پہنتے تھے۔ مولانا بتاتے ہیں کہ وہ بڑے بڑے پگڑ باندھتے تھے۔ اور یہ راجپوت ہندوؤں کا خاص لباس ہوتا تھا۔ تحفے تحائف کا بھی تبادلہ ہوتا۔

مولانا کے ذہن میں اپنے بچپن اور لڑکپن کی اس طرح کی کوئی یاد نہیں جس سے ہندو مسلم سماج

میں نفرت یا تلخی کی نشان دہی ہوتی ہو۔ حالانکہ یہ لوگ اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے جن سے مولانا کے آباواجداد مسلمان ہوئے تھے۔ دین کی یہ تبدیلی کسی منافرت یا عداوت کا باعث نہیں بنی تھی۔ مولانا مزید بتاتے ہیں کہ اسلام نے ان کے اندر صرف عقائد کی تبدیلی کی تھی یا حلال حرام کے بارے میں لوگ متنبہ ہوئے تھے۔ لیکن جہاں تک سماجی اور تہذیبی رکھ رکھاؤ تھا، رسم و رواج تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ بلکہ ان کا کہنا تھا کہ راجپوتوں والی انا اور احساس تفاخر مسلمان ہونے کے بعد بھی ہم میں موجود تھا۔ مولانا تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی اس حوالے سے مدرسہ میں بہت اصلاح ہوئی۔ وہ فرماتے ہیں:

''مجھ میں ایک قسم کا اکھڑپن بھی تھا جس کی مولانا حمید الدین نے خاص طور پر تہذیب کی۔''

اس حوالے سے مولانا اپنے استاد کی حساسیت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے نوٹ کیا کہ وہ اپنے ایک بیٹے کو مرزا، ایک کو مغل اور ایک کو شاہد خاں یعنی پٹھان کہتے تھے۔ ہم اس پر بہت حیران ہوتے۔ آخر ہم نے ایک دن اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے یہ نام ان کے مزاج کی وجہ سے رکھے ہیں۔ ان کے نزدیک قوموں میں ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو افراد کی طبیعت میں منعکس ہوتا ہے۔

راجپوت یعنی ''حکمرانوں کی اولاد'' ہندستان کی اشرافیہ ہے۔ انھیں معاشرے میں سیاسی، مذہبی اور سماجی لحاظ سے ہمیشہ سے ایک برتر حیثیت حاصل رہی۔ یوں ان کے ہاں احساس تفاخر کا پایا جانا ایک فطری عمل ہے۔ مولانا نے اس بارے میں تبصرہ فرمایا کہ زمانے کی گردشوں نے اگرچہ ان سے اقتدار اور سماجی رتبہ چھین لیا یا دیگر قومیں بھی ان کے مقابلے میں آگئیں، لیکن ان کے اندر احساس تفاخر باقی رہا۔

مولانا نے اپنی معاشرت میں عوامی سطح پر اس طرح کے بھی کسی تاثر کی نفی فرمائی کہ ایسی گھٹن یا طبقاتی محرومی یا کشمکش موجود تھی جس سے نکلنے کی کوئی تحریک یا خواہش پائی جاتی ہو۔ وہ اپنے سماجی حالات کو پرامن اور بھائی چارے کی قدروں میں بندھا ہوا دیکھتے تھے۔

مدرسۃ الاصلاح کے قیام کا پس منظر

مولانا نے مدرسۃ الاصلاح میں اپنے داخلے کی داستان سناتے ہوئے اس کے وجود پذیر ہونے کا

بطور خاص تذکرہ کیا۔ مولانا نے ان واقعات وحادثات کی طرف ایک بلیغ تبصرہ کیا اور بتایا کہ مولانا شبلی نعمانی نے مدرسے کے قیام میں کیا کردار ادا کیا اور کیوں کیا:

"مولانا شبلی نعمانی اپنی جہاں گردی سے تھک کر اعظم گڑھ آ گئے۔ انھوں نے وہاں قیام کا فیصلہ کیا۔ باہر کی ساری سرگرمیاں — لکھنؤ وغیرہ کی — وہ سب چھوڑ چکے تھے۔ وہ پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے اور یہ بطور استعارہ نہیں کہہ رہا، ایسا ہی ہوا۔ ان کا پاؤں کٹ گیا۔ پھر کان پور کا حادثہ ہو گیا۔ مولوی لوگوں کو زنجیریں پہنائی گئیں تو وہ تڑپ اٹھے۔ ان کے بھائی فوت ہو گئے۔ ان سب کا ان کی شاعری اور ہر چیز پر اثر پڑا۔ اور جب وہ اعظم گڑھ میں "معتکف" ہوئے تو وہ خاموش رہنے والوں میں سے نہیں تھے۔ وہ بڑی بافیض ہستی تھے۔ وہ تو جہاں بیٹھ جاتے، وہاں باغ و چمن پیدا ہو جاتے۔ نہریں جاری ہو جاتیں۔ دارالمصنفین کا تصور تو پہلے ہی ان کے دل و دماغ میں تھا۔ اس کی انھوں نے داغ بیل ڈال دی۔ نیشنل ہائی اسکول، شبلی کالج بن گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی توجہ مدرسہ اصلاح المسلمین کی طرف گئی۔ اس کی وجہ ندوہ کا حادثہ ہے... وہ اپنے تصورات کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ مولانا ہرگز ایسے آدمی نہیں تھے جو یونہی عمر گزار جائیں۔ وہ چلتے پھرتے طوفان تھے۔ اب ان کو خیال آیا کہ دینی تعلیم کا ایک ادارہ یہاں ہونا چاہیے۔ اس خیال میں ندوہ سے مایوسی کا بھی دخل ہو سکتا ہے۔ یوں وہ مدرسۃ الاصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔"

یہ تمام جملے محض جملے نہیں یہ پوری پوری تلمیحات ہیں۔ یہ ماضی کے گمبھیر حوادث اور مستقبل میں ہونے والے انتہائی دور رس حالات کی طرف اشارہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ناگزیر ہے۔

1857ء کی جنگ میں ناکامی کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کی باشعور اشرافیہ اس نتیجے پر پہنچی کہ مسلح جدوجہد سے وہ اب اپنے حالات میں بہتری نہیں لا سکتے۔ اس نتیجے پر پہنچ کر ان کے ہاں تین طرح کے دبستان پیدا ہوئے۔ پہلے کا ظہور 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کی شکل میں ہوا۔ استاد محترم جاوید احمد صاحب غامدی کے الفاظ میں یہ دبستان اِس بات پر مصر ہوا کہ نہ دین کو خاص اپنے مکتب فکر کے اصول و مبادی اور اپنے اکابر کی آرا سے بالاتر ہو کر براہ راست قرآن و سنت سے سمجھنا ممکن ہے اور نہ مغربی تہذیب اور اُس کے علوم اِس کے مستحق ہیں کہ وہ کسی پہلو

سے اہل دین کی نظروں میں ٹھیریں۔ اِس گروہ کے بڑوں میں قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، محمود الحسن دیوبندی، انور شاہ کاشمیری، حسین احمد مدنی، اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثمانی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ (مقامات 55)

اس کے بالکل مقابل ایک دوسرا گروہ تھا۔ اس کے خیال میں حق و باطل کا معیار وہی تہذیب اور اُسی کے علوم قرار پائے جن کے ہاتھوں ہم نے شکست کھائی تھی۔ یعنی انگریز کا نہ صرف علم، بلکہ اس کی تہذیب اور ترقی میں اسی کا لائحۂ عمل نسخۂ کیمیا ٹھہرا۔ اس کے سرخیل سرسید احمد خان تھے جنھوں نے علی گڑھ میں 1857ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی داغ بیل ڈالی۔

ان دو کے مقابل مولانا شبلی ایک تیسرے دبستان کے علم بردار تھے۔ اس دبستان کے بنیادی اصول کیا تھے؟ استاد محترم لکھتے ہیں:

> ”اِس جماعت کے بنیادی اصول دو تھے: ایک یہ کہ ہمارے لیے ترقی یہی ہے کہ ہم پیچھے ہٹتے چلے جائیں، یہاں تک کہ اُس دور میں پہنچ جائیں جب قرآن اتر رہا تھا اور جب خدا کا آخری پیغمبر خود انسانوں سے مخاطب تھا۔ اور دوسرے یہ کہ یہ خود قدیم کی ضرورت ہے کہ ہم جدید سے بھی اُسی طرح آشنا رہیں، جس طرح قدیم سے ہماری شناسائی ہے۔ سید سلیمان ندوی، ابو الکلام آزاد، ابو الاعلیٰ مودودی، حمید الدین فراہی، امین احسن اصلاحی، یہ سب اِسی جماعت کے اکابر ہیں۔ میں اِسے ”دبستان شبلی“ کہتا ہوں۔“ (مقامات 56)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شبلی اپنے استاد مولوی فاروق چڑیا کوٹی سے علم کا سفر شروع کرتے ہیں۔ انھی کے اثر سے امام ابو حنیفہ سے شدید متاثر ہو کر ان کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنا کر ”نعمانی“ بھی ہو جاتے ہیں۔ پھر جدید طرز تعلیم کا وہ شعبہ اختیار کرتے ہیں جو اپنے وقت کا مقبول ترین اور سب سے معروف ہے، یعنی وکالت۔ لیکن ان کے اندر کی جولانیِ طبع نہ ان کو فقہ حنفی کا اسیر رہنے دیتی ہے اور نہ وکالت کا پیشہ ان کے ذوق کی تسکین کر پاتا ہے۔ سرسید ان کی بے پناہ صلاحیتوں سے متاثر ہوتے ہیں اور انھیں اپنے کالج کے شعبۂ تدریس میں شامل کر لیتے ہیں۔ جہاں تک خدمت علم اور تعلق خاطر کا تقاضا ہے وہ علی گڑھ میں سید صاحب کی وفات تک تدریس کرتے ہیں۔ اور جہاں تک تشنگی علم کا تعلق ہے تو وہ پروفیسر تھامس آرنلڈ کو عربی پڑھانے کے عوض ان سے فرانسیسی سیکھتے ہیں، یورپ کا سفر کرتے ہیں۔ مصر و عرب کا دورہ کرتے ہیں۔ وہ صرف علم کے

بحرِ ذخّار ہی میں غوطہ زن نہیں ہوتے، بلکہ اس وقت کی دنیا کا بچشم سر مشاہدہ کرتے ہیں۔ مصر میں محمد عبدہ اور ترکی میں سلطان عبدالحمید ثانی سے ملاقات کرتے ہیں۔

وہ سرسید سے اس حد تک تو فکری اتفاق رکھتے تھے کہ ملت کی بقا اور ترقی کا راز علم کی فراوانی اور ترویج ہی میں مضمر ہے۔ لیکن وہ ان کے سیاسی و سماجی افکار کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے جید شاگرد سید سلیمان ندوی کے اس اقتباس سے ہوتا ہے:

> ”کوئی غیر قوم جب کسی دوسرے ملک پر حکومت کرتی ہے تو اس کی سلطنت کا سب سے کامیاب اصول یہ ہوتا ہے کہ وہ محکوم قوم کے افراد اور طبقوں میں اختلافات پیدا کر دے۔ ہندوستان کے مسلمان اور ہندو صدیوں کی جنگ و جدل اور لڑائی بھڑائی کے بعد وحدتِ ملکی کی ایک سطح پر آ گئے تھے جن کا لباس قریب قریب ایک تھا۔ تمدن یکساں ہو گیا تھا، زبان ایک ہو گئی تھی، مگر انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا کام یہ کیا کہ فارسی کو سرکاری دفتروں سے خارج کر کے اردو کو اس کی جگہ دی اور اس کے بعد فورٹ ولیم کالج میں بیٹھ کر اردو کے ساتھ ایک نئی زبان کا کالبُد تیار کیا اور اس کا نام ہندی رکھا۔ پہلی مسلمانوں کی اور دوسری ہندوؤں کی زبان قرار دی۔ اختلاف کا یہ اثر آگے کو پھیلا اور رفتہ رفتہ سارے ملک پر چھا گیا۔“ (حیاتِ شبلی۔ صفحہ 401-400)

یعنی مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی سرسید کے دو قومی نظریے، اردو ہندی اختلافات وغیرہ جیسے مناقشات کو قومی مفاد کے خلاف انگریزوں کی سازش سمجھتے تھے، جس کو پروان چڑھانے میں سید صاحب نے بڑی نیک نیتی سے اپنا کردار ادا کیا۔

یہ اختلاف تعبیر دین اور لائحۂ عمل کا بھی تھا۔ اس حوالے سے ”حیات شبلی“ میں بیسیوں اختلافات کا ذکر ہے، لیکن ہم طوالت کے خوف سے محض ایک اور اقتباس یہاں درج کرتے ہیں:

> ”ان واقعات کے ساتھ ”الفاروق“ کی تصنیف میں جو اختلافِ راے پیدا تھا وہ بھی شمار کے لائق ہے۔ ایک (سرسید) کے نزدیک حضرت عمر فاروق صرف رسول کی حکومت و سلطنت کے نمایندہ تھے اور دوسرے کے نزدیک وہ ”آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری“ (یعنی تمام کمالات آپ ہی کی ذات میں جمع ہیں) کے مصداق تھے۔ اس سلسلے میں سرسید نے خلفاے راشدین کی نسبت اپنے نج کے خط اور اخباری مضمون میں جو راے ظاہر کی، مولانا جیسے شیفتۂ اصحابِ رسول

کے لیے اس کا برداشت کرنا آسان نہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ''الفاروق'' پوری محنت سے لکھی اور سرسید کے اعتراض واختلافات اور ناراضی کی کوئی پروانہ کی۔ مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج سرسید کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں اور مولانا شبلی کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ مولانا نے ندوہ کے کسی جلسہ میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں، یہاں تک کہ صحابہ سے جا کر مل جائیں۔ سرسید کو ان کی اس تقریر پر بڑا غصہ آیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحتیں اس راستے سے پیچھے ہٹا دیں گی جس پر وہ لے جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے خلاف انھوں نے سخت مضمون لکھا۔'' (حیات شبلی 268)

مزید دیکھیں کہ جب سرسید نے اپنی تفسیر قرآن کا ترجمہ شبلی سے کرانا چاہا تو انھوں نے مصروفیات کا عذر کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایش کی کہ مولانا حمید الدین فراہی سے کہا جائے۔ ظاہر ہے وہ شبلی کے شاگرد بھی تھے اور بھانجے بھی، اس لیے شبلی کے بعد ان کی نظر انتخاب ان پر پڑی۔ وہ ان دنوں کالج میں تعلیم کے سلسلے میں موجود تھے۔ اور اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے تھے، مگر انھوں نے بھی انکار کر دیا۔ جب سرسید نے بااصرار وجہ پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون عَلَی الْاِثْم کے گناہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے۔ (حیات شبلی 288)

شبلی کی علی گڑھ سے بے زاری کی ایک بڑی وجہ سرسید کی آمرانہ طبیعت بھی تھی۔ اس کے مقابلے میں شبلی کے اندر کمال درجے کی رواداری اور جمہوریت پسند مزاج تھا۔ جس کا اظہار سیاسی، انتظامی اور فکری، غرض ہر طرح کے امور میں ہوا۔ مثلاً سرسید کانگرس کے سخت خلاف جب کہ شبلی اسے اتحاد قومی کا ذریعہ اور انگریزی حکومت سے مطالبات منوانے کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ سرسید نے اس پر شدید تنقید کی۔ پھر وہ ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے اور وفات تک اسی سیاسی نظریے پر قائم رہے۔

سرسید سے اس گہرے اختلاف کے باوجود انھوں نے اگر ان سے تعلق خاطر رکھا تو اس کی وجہ وہ عمدہ تہذیب اور شرافت کا چلن تھا جس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ واضح ہو

جاتا ہے کہ شبلی ایک دوسرے نظریے اور ایک دوسرے نظام فکر کے حدی خواں تھے۔ اور اس کی شہادت ان کی حیدر آباد میں جامعۂ عثمانیہ اور پھر ندوۃ العلما لکھنؤ میں مصروفیت سے بھی ملتی ہے۔

علی گڑھ کالج کی علمی مصروفیات اور کارناموں نے انھیں پورے ہندستان میں ایک ممتاز اور منفرد شاعر، ادیب و نقاد اور عبقری عالم دین اور ماہر تعلیم کے طور پر بھی متعارف کرا دیا تھا۔ چنانچہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد حیدر آباد کے نظام کی درخواست پر وہ جامعۂ عثمانیہ میں مشیر ہو گئے۔

ادھر 1892ء میں ندوۃ العلما قائم ہوا۔ اس کی تحریک کان پور میں علی گڑھ ہی سے مستفید علما نے پیدا کی تھی۔ یہ سب لوگ سرسید کے نظریے کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سرسید کے فکر سے متاثر تعلیمی ادارے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہیں۔ وہ یک رخے ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ملک بھر کے علما کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور مسلمانوں کی درست سمت علمی و مذہبی رہنمائی کی جائے۔ مولانا شبلی نعمانی پہلے ہی اجلاس سے اس قافلے میں شریک ہو گئے اور غیر معمولی تقریر کی۔

اس ادارے کے ہر دو سال بعد اجلاس ہوتے رہے۔ ان میں شبلی باقاعدگی سے سرگرم رکن کی حیثیت سے موجود ہوتے۔ علما نے جدید و قدیم تصورات کے تحت ایک معتدل دارالعلوم قائم کرنے کا فیصلہ تو اوّلین جلسوں ہی میں کر لیا تھا، لیکن طویل مشوروں کے بعد چوتھے جلسے میں عملی طور پر دارالعلوم قائم ہو گیا۔ یوں لکھنؤ میں ستمبر 1898 میں سرسید کی وفات کے چھ ماہ بعد ''دارالعلوم ندوۃ العلما'' قائم ہو گیا۔

شبلی نے اس مدرسے سے اپنی بہت سی امیدیں اور خواب وابستہ کر لیے۔ ندوہ کی کونسل میں دیوبند سمیت ہر مکتبۂ فکر کے ہندستان بھر سے جید علما شامل تھے۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ اتحاد و اتفاق سے یہ برصغیر ہی نہیں عالم اسلام کا ایک عظیم تعلیمی ادارہ ہو گا۔ چنانچہ 1905ء میں وہ عملی طور پر بھی اس سے متعلق ہو گئے۔ وہ ادارے کے معتمد یعنی سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔

شبلی نے جب ندوہ میں قیام کا فیصلہ کیا تھا تو نواب محسن الملک نے ایک پیشن گوئی کی تھی۔ انھوں نے شبلی کو کہا کہ ندوہ کی اس کسمپرسی میں کوئی شخص آپ کا مزاحم نہ ہو گا، لیکن جب ترقی کے آثار نمایاں ہوں گے تو دفعتہً سارے مولوی آپ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ (حیات شبلی 639)

شبلی جب تک جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد سے منسلک رہے، انھیں ندوہ سے گہری توقعات رہیں،

لیکن جب وہ ادارے کے معتمد بن گئے تو آہستہ آہستہ انھیں احساس ہونا شروع ہو گیا کہ یہ وہ قافلہ نہیں ہے جس کی حدی خوانی کی انھوں نے اتنی تمنا کی تھی۔ مثلاً انھیں مدرسے کے نصاب میں انگریزی کو بطور مضمون شامل کرنے میں ایک طویل جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک عام آدمی کے لیے تو انگریزی کی تحصیل پر فتوے ختم ہو گئے تھے، لیکن علما کا انگریزی سیکھنا جرم عظیم سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ شبلی اسے بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ بلکہ وہ سنسکرت اور ہندی کو بھی بنیادی زبانوں کی تدریس میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ مگر جب اس تجویز کو رد کر دیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اسے ایک تجویز ہی کے طور پر رکھ لیا جائے، لیکن ایسا کرنا بھی گوارا نہ کیا گیا۔ اور جب وہ معتمد بن گئے تو اسے داخل نصاب کیا گیا۔ لیکن یہیں سے ان کی مخالفت کا آغاز بھی ہو گیا۔ یوں انھوں نے اختیارات ملنے کے بعد اصلاح کی کوششیں جاری رکھیں۔ اور اس میں انھیں بہت حد تک کامیابیاں بھی ملیں۔ ندوہ کے طلبہ اپنی علمی استعداد اور قابلیت میں ہندستان کے ممتاز ترین علما میں شمار ہونے لگے۔

ان عظیم کامیابیوں کے باوجود حاسدین اور مخالفین کی ایک جماعت ان کے درپے ہو گئی۔ ان پر الزامات لگنے لگے کہ وہ تو اصل میں سرسید ہی کے ''ایجنٹ'' ہیں اور انھی کا ایجنڈا پورا کرنے آئے ہیں۔ تقوے کے ہیضے کا شکار ان کو ''شعار اسلام'' میں کمی کے مجرم ٹھیرانے لگے۔ روایت کے اسیر مذہب میں عقل کو داخل کرنے کے ناقابل معافی جرم پر ان کے دشمن ہو گئے۔ ان کے نزدیک مذہب ماننے کی چیز تھی، اس کو عقل پر پرکھنا ''سواد اعظم'' کے خلاف تھا۔ شبلی مجسم اخلاص اور انسان کی عزت نفس کے محافظ تھے، ان بے سوادیوں پر بہت بد مزا ہوئے۔ بہت کوششوں کے بعد بھی جب ان کی ہمتیں جواب دے گئیں تو 1912ء میں پہلے مدرسہ، جو اب یونیورسٹی بن چکا تھا، کے مجلے ''ندوہ'' سے اور پھر 1913ء میں دار العلوم سے مستعفی ہو گئے۔ اور اس حالت میں مستعفی ہوئے کہ ہندستان بھر سے ان سے محبت کرنے والے انھیں ندوہ واپس آنے کی اپیلیں کر رہے ہیں اور طلبہ ان کے جانے پر ہڑتالیں کر رہے ہیں اور شبلی ہیں کہ خاموشی سے اعظم گڑھ چلے آئے۔ ندوہ کے ناظم وہی مولانا خلیل الرحمان بنا دیے گئے جو ندوہ کو خالص قدیم طرز پر چلانا چاہتے تھے اور جو اس لحاظ سے قیامِ ندوہ کے بنیادی اغراض و مقاصد سے بھی متفق نہیں تھے۔ گویا:

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب

اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

یہ ہے مولانا کے ان جملوں کی تفصیل جن کو انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا: ”مولانا شبلی نعمانی اپنی جہاں گردی سے تھک کر وہاں آ گئے۔ انھوں نے اعظم گڑھ میں قیام کا فیصلہ کیا۔ باہر کی ساری سرگرمیاں — لکھنؤ وغیرہ کی — وہ سب چھوڑ چکے تھے۔“

اس کے بعد مولانا اصلاحی ان کے پاؤں کے حادثے کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شبلی ایک تقریب میں شرکت کے لیے 17 مئی 1907 کو اعظم گڑھ گئے۔ دفتر سے اٹھ کر زنان خانے میں گئے۔ اندر نشست پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ وہاں ایک بندوق بھی پڑی ہوئی تھی۔ یہ بندوق ان کے بیٹے حامد حسن نے کووں کو مارنے کے لیے رکھی تھی۔ وہ لیچی کے باغ میں پھلوں کا نقصان کرتے تھے۔ بندوق بھری ہوئی تھی۔ مولانا نے اسے اپنی بہو کو دینا چاہی تاکہ وہ اسے کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیں، لیکن پکڑاتے ہوئے بندوق کی لبلبی دب گئی۔ بندوق کا رخ اگرچہ نیچے کی طرف تھا، لیکن نال کا رخ ان کے پاؤں کی طرف تھا اور وہ بھی محض ایک بالشت کے فاصلے پر۔ بقول سید سلیمان ندوی کے مولانا کا ٹخنہ چور ہو گیا، پاؤں پنڈلی سے محض دو تسمے سے لٹک رہا تھا۔ باہر نکالا تو ایڑی جوتے ہی میں رہ گئی۔ اس حادثے میں مولانا کا پاؤں پنڈلی سے کاٹنا پڑا۔ باقی عمر انھوں نے مصنوعی پاؤں لگا کر بسر کی۔

اس حادثے نے مولانا کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ وہ تین ماہ سے زیادہ اعظم گڑھ ہی میں رہے۔ اسی کو مولانا اصلاحی ”اعتکاف“ سے تعبیر کر رہے ہیں۔ جس میں انھوں نے شاعری بھی کی اور مستقبل کے منصوبے بھی بنائے۔ مولانا نے شبلی کے اس شعر کی بطور خاص تحسین کی:

شبلی نامہ سیہ را بخبر اے عملش

پا بریدند و صدا خاست کہ سر می بایست

مفہوم کچھ یوں ہے کہ شبلی سیاہ کار کا پاؤں کٹ گیا اس کے گناہوں کی پاداش میں۔ اور غیب سے آواز آئی، نہیں اس کا سر کاٹ کر لاؤ۔

کان پور کے حادثے اور مولویوں کو زنجیر پہنانے کا قصہ یہ ہے کہ 1913ء میں یوپی صوبے میں واقع شہر کان پور کی ایک سڑک کی توسیع کی گئی۔ نقشے میں مچھلی بازار کے مقام پر ایک مسجد بھی

اس توسیع کا حصہ بنتی تھی۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا تو مسجد کا صرف مشرقی حصہ اس میں شامل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ حصہ مسجد کے طہارت خانوں پر مشتمل تھا اور انگریز حکومت نے اس کا متبادل دینے کا بھی اعلان کر دیا۔ کچھ جذباتی مسلمان اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے مقدمہ بھی کیا، لیکن فیصلہ ان کے خلاف ہوا۔ حکومت نے فیصلہ آنے کے بعد مسجد کا مشرقی حصہ گرا دیا اور سڑک کی تعمیر شروع کر دی۔ مسلمانوں نے مسمار حصے کو دوبارہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب انھوں نے سڑک کو ہٹانا شروع کیا تو ان پر فائرنگ کر دی گئی۔ مسلمانوں کا فیصلہ اگر غیر قانونی اور جذباتی تھا تو انگریز حکومت کا اقدام بھی ظالمانہ تھا۔ اس فائرنگ کی زد میں آکر بچوں سمیت درجن بھر مسلمان شہید ہو گئے۔ اس سانحہ پر شبلی کی طرف سے ایک طویل نظم لکھی گئی۔ وہ اپنے پاؤں کے زخم کے خراب ہو جانے سے احتجاج میں شریک نہ ہو سکے۔ وہ اپنے علاج ہی کے سلسلے میں بمبئ گئے ہوئے تھے۔ مولانا نے شبلی کی اس نظم کے ان اشعار کی بطور خاص بہت تحسین کی:

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ بچے ہیں سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے
شہیدان وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئ میں رہ کے محروم سعادت ہے

بھائی کی وفات اور اسکول کے کالج بننے کی تفصیل یہ ہے کہ مولوی اسحاق شبلی کے چھوٹے بھائی تھے۔ کامیاب وکیل اور سرگرم سیاسی رہنما تھے۔ مسلم لیگی تھے، لیکن جداگانہ انتخاب کے سخت خلاف۔ شبلی کی طرح وہ بھی اسے قومی وحدت کے خلاف انگریزوں کی سازش سمجھتے تھے۔ انھوں نے شبلی کو خاندان کی زمینوں اور دوسرے معاملات سے فراغت کرا رکھی تھی تاکہ وہ علمی اور ملی کاموں میں دل جمعی سے حصہ لیتے رہیں۔ وہ 5 اگست 1914 کو انتقال کر گئے۔ یہ شبلی کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ اعظم گڑھ میں وہ پہلے ہی ڈیرے ڈال چکے تھے۔ اب بھائی کی وفات پر وہ بالکل وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن بھائی کی وفات کا غم انھوں نے اس طرح کاٹا کہ ان کے چھوڑے ادھورے کام مکمل کرنے کی کوشش کی۔

سرائے میر میں شبلی کے خاندان والوں نے نیشنل اسکول کے نام سے ایک معیاری تعلیم گاہ قائم کی تھی۔ اسے حکومتی امداد بھی حاصل تھی۔ لیکن بوجوہ اسکول کی تنزلی ہوئی اور یہ مڈل ہو

گیا۔ مولوی اسحاق نے اسے دوبارہ منظم کیا۔ اور اسے ہائی درجے تک لے گئے اور بھائی کو بتایا کہ وہ اسے کالج تک ترقی دینے کا منصوبہ رکھتے ہیں۔ تب شبلی نے اسے کالج بنانے کا منصوبہ اپنے ہاتھ میں لیا، لیکن وہ اسے مکمل کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ شبلی کے خاندان نے اپنی محنت جاری رکھی اور آخر یہ اسکول ان کی وصیت کے مطابق 1940ء میں کالج کا درجہ پانے میں کامیاب ہو گیا اور اس کا نام شبلی کالج رکھا گیا۔ مولانا نے اسی کا ذکر کیا ہے۔

دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح قائم کرنے کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا حمید الدین فراہی کے گاؤں پھریہہ کے پاس ان کے رشتے داروں اور دوسرے نیک دل مسلمانوں نے اصلاح المسلمین کے نام سے 1906ء میں ایک انجمن بنائی۔ یہ ایک پلیٹ فارم تھا جہاں وقتاً فوقتاً علما آتے اور وعظ کرتے۔ ان علما میں عبدالحق حقانی اور مولانا ثناءاللہ امرتسری جیسے مشہور علما بھی ہوتے۔ یہی انجمن 1909ء میں باقاعدہ ایک مدرسہ بن گئی۔ کچھ کچے کمروں کی سادہ سی عمارت بھی بنادی گئی۔ لوگ متوجہ ہوئے تو 1910ء میں شبلی سے اس کی سرپرستی کی درخواست کی گئی۔ وہ ان دنوں ندوہ میں تھے۔ انھوں نے یہاں پر ایک شان دار جلسہ منعقد کرایا جس میں مولانا عبیداللہ سندھی کو خاص طور پر مدعو کیا گیا۔ یہ شبلی کی ان سے پہلی ملاقات تھی۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی آمد کی وجہ مولانا حمید الدین فراہی تھے جو ان دنوں شبلی ہی کے حکم پر کراچی میں تدریس کر رہے تھے اور وہاں پر ان کی مولانا سندھی سے قرآن فہمی پر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس جلسے سے اردگرد کے علاقوں میں مدرسے کا اچھا تعارف ہو گیا۔

اس جلسے کے بعد اپریل 1910ء ہی میں شبلی نے مولانا حمید الدین فراہی کو خط لکھا کہ وہ چند روز کے لیے سرائے میر آجائیں تاکہ مدرسے کو بہتر کیا جائے۔

مولانا اصلاحی اسی خط کا ذکر کرتے ہیں کہ اس کے بعد ہی اس بدحال مدرسے کی حالت بہتر ہوئی۔ شبلی نے مدرسہ کے ناظم مولوی فیض الحسن کو طریقے سلیقے سے فارغ کر دیا کیونکہ لوگوں کو ان سے بہت شکایات تھیں۔ (مولانا سلیمان ندوی)

شبلی نے ندوہ سے دو بہت قابل اور ذہین طلبہ کو بھی بلا لیا۔ یہ عبدالرحمان نگرامی اور معین الدین تھے۔ نگرامی وہی استاد ہیں جن کا ذکر مولانا اصلاحی بطور خاص اپنے عربی استاد کی حیثیت سے کرتے ہیں اور ان کا مزید تذکرہ ابھی آگے آرہا ہے۔

پھر جب شبلی ندوہ سے بالکل فارغ ہوئے تو انھیں خیال ہوا کہ وہ اسی مدرسے کو اپنے خوابوں کی تعبیر دیں۔ چنانچہ اپنے بھائی مولوی اسحاق کی وفات سے پہلے انھوں نے مولانا حمید الدین فراہی کو ایک تاریخی خط لکھا۔ وہ ان دنوں حیدرآباد میں تھے۔ اور شبلی ہی کے توسط سے ان کی ملازمت کے معاملات طے ہو رہے تھے۔ حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فراہی تمام زندگی اپنے استاد ہی کے حکم سے ملازمت کرتے اور اداروں سے وابستہ رہے۔ شبلی نے لکھا:

"بحث یہ ہے کہ ہماری قومی قوت سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڑھ پر، دونوں کے برداشت کے قابل قوم نہیں ہے۔ کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہیے اور ان کا باہمی تعلق بھی۔

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین اور دنیا، دونوں تعلیموں کا مرکز بنایا جائے۔ یہیں خُدّامِ دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو، ندوہ میں لوگ کام نہیں کرنے دیتے تو اور کوئی دائرۂ عمل بنانا چاہیے، ہم سب کو وہیں بود و باش کرنی چاہیے، ایک معقول کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہیے، اگر تم بہ عزم جَزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں۔

آج ڈائریکٹر تعلیمات سے تمھارے متعلق فیصلہ کرانا ہے، صرف یہی ایک زینہ رہ گیا ہے، لیکن یہ فیصلہ موافق بھی ہو جائے تب بھی میں اس کو قومی خدمت پر ترجیح نہیں دیتا، البتہ کچھ معاش کا سہارا ہونا چاہیے وہ بقدرِ کفاف کسی نہ کسی طرح ہوتا رہے گا۔ آخر تمھارا بھی خود خیال تھا، پرنسپلی اور بیش قرار تنخواہ چند روزہ ہیں اور یہ کام ابدی ہے۔" (مکتوبات شبلی، حمید 67)

اس کے بعد مولوی اسحاق کی وفات ہو گئی۔ اور شبلی اعظم گڑھ آ کر یہاں کے منتشر کاموں کو اکٹھا کرنے لگے۔ ان کے ذہن میں جب وہ منصوبہ اچھی طرح آ گیا، جس کا انھوں نے مولانا فراہی سے تذکرہ کیا تو وہ سرائے میر کے ادارے کی سربراہی کے لیے کسی مناسب استاد کا نام سوچنے لگے۔ اس پر جب امام حمید الدین نے انھیں لکھا کہ آپ خود کیوں نہیں مدرسے کی نظامت قبول فرماتے تو اس کے جواب میں 21 ستمبر 1914 کو لکھا:

"بھائی بہ ایں ضعف و دل شکستگی مدرسۂ سرائے میر کی نظامت کیوں کر کر سکتا ہوں، کوئی دوسرا شخص سوچو، امکانی مدد کرتا رہوں گا۔" (مکتوبات شبلی، حمید 75)

بالآخر انھوں نے سوچ بچار کے بعد اکتوبر 1914 کے شروع میں مولوی مسعود علی صاحب کو اعظم گڑھ بلایا، پھر انھوں نے مولوی شبلی متکلم کو اس کام کے لیے مقرر کیا۔ شبلی کے ذہن میں اس وقت دارالمصنفین، درجۂ تکمیل اور سرائے میر کو ملا کر ایک اچھی خاصی جامعۂ اسلامیہ کا تصور تھا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے شاگردوں کو بلا بھیجا۔ یہ لوگ جب جمع ہوئے تو شبلی مرض الموت کے ساتھ بستر پر تھے۔

شبلی کی وفات کے تیسرے روز مولانا حمید الدین نے شبلی کے چند شاگردوں کو لے کر ایک مجلس بنائی۔ اس کا نام اخوان الصفار کھا اور اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ شبلی مرحوم کے ادھورے کاموں کو مکمل کیا جائے۔ اس مجلس میں مولانا حمید الدین کے ساتھ یہ لوگ شامل تھے:

مولوی مسعود علی ندوی، مولوی شبلی متکلم ندوی اور سید سلیمان ندوی۔

مولانا حمید الدین فراہی نے حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنی زندگی اس کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور قرآن پاک کی تعلیم و تدریس اور اس کا خاص مقصد قرار دے کر اس کا ایک خاص نصاب بنایا۔

یوں اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی تھی کہ شبلی کی زندگی کے آخری دنوں میں مدرسے کے حوالے سے ان کی مراد پوری ہو۔ اور یہی وہ سارے حالات تھے جن کی طرف مولانا نے چند جملوں میں خلاصہ کرتے ہوئے بطور خاص فرمایا تھا کہ ان واقعات کی تفصیل آپ کے ذمے ہے!

[باقی]

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

شہر آشوب

اٹھتا ہے یہ ہر لفظ سے جو دل کا دھواں ہے
پھر اِس میں عجب کیا کہ غزل مرثیہ خواں ہے

سینے میں کوئی درد ہے، پنہاں کبھی پیدا
پہلو میں دھڑکتا تھا جو آنکھوں سے رواں ہے

وہ دن ہے کہ ویرانیِ دل کھانے کو آئے
وہ شب ہے کہ ہر سانس پہ اک بارِ گراں ہے

تہذیب نے کچھ اور بھی سفاک بنا کر
آدم کو بتایا ہے کہ یہ تیرا جہاں ہے

دنیا کی سیاست میں کوئی حق ہے نہ باطل
ہر چیز یہاں معرکۂ سود و زیاں ہے

اٹھتی ہے صدا کوئی تو اربابِ سیاست
اُس کو یہ سمجھتے ہیں کہ غوغائے سگاں ہے

افسوس کہ پژمردہ ہے انصاف کا چہرہ
اور ظلم کو دیکھیں تو وہ پہلے سے جواں ہے
بغداد میں یہ آہن و آتش کا تماشا
روتی ہے زمیں اور فلک اشک فشاں ہے
خورشیدِ جہاں تاب تو ہے اب بھی افق پر
اِس شہر میں لیکن شبِ تیرہ کا سماں ہے
واللہ کہ تم درپئے بربادیِ جاں ہو
یہ شہر مری عظمتِ رفتہ کا نشاں ہے
اڑتا ہوا خاشاک، یہ بکھری ہوئی لاشیں
انساں ہیں، مگر اُن پہ بھی سایوں کا گماں ہے
بارود کی بارش ہے شب و روز یہاں اب
بچوں کو اماں ہے، نہ بزرگوں کو اماں ہے
یہ ماؤں کی آغوش میں آزردہ نگاہیں
سنتا ہو اگر کوئی تو اُن کی بھی زباں ہے
میں عاجز و درماندہ اِسے دیکھ رہا ہوں
دینے کو اگر ہے تو یہی سوزِ نہاں ہے
ابلیس کے ہاتھوں میں ہے دنیا کی حکومت
یہ تیرا جہاں ہے تو خدایا، تو کہاں ہے

سید منظور الحسن

اللہ کا اپنے بندوں پر حق

[مسند احمد کی روایت، رقم 13742 سے ماخوذ]

پوچھا یہ پیمبرؐ نے معاذؓ ابنِ جبل سے
اللہ کا حق کیا ہے بھلا بندوں پہ اُس کے؟
بولے یہ معاذ آپ پہ جاں میری فدا ہو
معلوم ہے یہ بات نبی اور خدا کو
فرمایا پیمبرؐ نے: ”سنو بات حقیقی
اللہ کا حق ہے کہ عبادت ہو اُسی کی
خالق ہے وہی سب کا، وہی سب کا الٰہ ہے
پوجا کا سزاوار فقط ایک خدا ہے
ساجھی نہیں اُس ذات کا دنیا میں کوئی اور
بچتے ہی رہو شرکِ الٰہی سے بہر طور“

پھر آپ نے پوچھا یہ معاذ ابنِ جبل سے
کیا حق ہے بھلا بندۂ مومن کا خدا پہ؟
بولے یہ معاذ آپ پہ جاں میری فدا ہو
معلوم ہے یہ بات نبیؐ اور خدا کو
یہ سن کے نبیؐ پاک بڑی شان سے بولے
رحمت کے، محبت کے نئے در کئی کھولے:
"جو بندہ خدا ہی کے لیے سر کو جھکائے
معبود کسی اور کو اپنا نہ بنائے
اللہ نے حق اُس کا کیا خود پہ یہ قائم
دوزخ کی سزا سے رہے محفوظ وہ دائم"

پیغام نبیؐ سے یہ ہمیں درس ملا ہے
توحید پہ ایمان میں انساں کی بقا ہے
جن ہو یا فرشتہ ہو یا انسان کوئی ہو
اللہ کا پیمبر ہو یا اللہ کا ولی ہو
محتاج ہے ہر نفس فقط اپنے ہی رب کا
سب دست نگر اُس کے ہیں، رازق ہے وہ سب کا
افلاک میں اُس کا کہیں ہم سر نہیں کوئی
معبودِ حقیقی سے بلند تر نہیں کوئی
گر بندے مصیبت میں خداوند کو بلائیں
مشکل کوئی آئے تو مدد اُس کی ہی چاہیں
حاجت کوئی دل میں ہو، کریں اُس سے دعائیں
سب درد و الم اپنے خداوند کو سنائیں

پھر اُن کا خدا اُن کے گناہ معاف کرے گا
محشر میں بھی رحمت کی نظر اُن پہ کرے گا

شاہد محمود

خبر نامہ ”المورد امریکہ“

[ستمبر 2023]

23 اعتراضات کے جواب میں: ”حدیث کیا ہے؟“ کا آغاز

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں ”حدیث کیا ہے؟“ کا موضوع زیر بحث ہے۔ ان نشستوں میں تابعین کے دور میں حدیث پر کام، حدیث کی تحقیق کے اصول، اس کے رد و قبول کے معیارات اور محدثین کی روایت جیسے اہم موضوعات زیر بحث رہے۔ ستمبر 2023 میں اس موضوع کی چار نشستیں نشر ہوئی ہیں۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

حسن الیاس صاحب کا دورۂ پاکستان

”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ“ کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ اکیڈیمکس محمد حسن الیاس جناب جاوید احمد غامدی کے ہم راہ بین الاقوامی دعوتی دورے پر ہیں۔ اِس سفر کے دوران میں وہ پاکستان بھی تشریف لائے۔ انھوں نے پاکستان کے شہر اسلام آباد میں ایک تقریب سے خطاب کیا۔ تقریب میں مختلف دینی پس منظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

حسن الیاس صاحب نے حاضرین کی طرف سے پوچھے گئے مختلف علمی، اخلاقی اور دینی سوالات کے جوابات دیتے ہوئے پاکستان میں معاشرتی جبر، مذہبی فکر کی تبدیلی اور اپنے علمی و فکری سفر کے بارے میں اظہار خیال بھی کیا۔ قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ہمارے ہاں کسی بھی علمی روایت میں قرآن مجید کو وہ حیثیت اور اہمیت نہیں دی گئی جو اسے دی جانی چاہیے تھی اور جس کا مطالبہ خود اللہ کی کتاب کرتی ہے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ کیسے ہمارے ہاں مسجد کے منبر کو فرقوں کی ترویج کے لیے استعمال کیا گیا اور اب ہم کیسے اس فرقہ پرستی سے نکل سکتے ہیں۔ مزید برآں انھوں نے امریکہ میں غامدی سینٹر کے دعوتی مشن میں پاکستانیوں کے تعاون کو بھی سراہا۔ یہ تقریب کئی گھنٹوں تک جاری رہی۔ اس تقریب کی ویڈیو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

''نئی نسل کو دین کی تعلیم کیسے دیں؟''

امریکہ و یورپ میں مسلمان اپنے بچوں کی دینی تعلیم کے بارے میں بہت فکر مند ہیں۔ نہ درس گاہوں میں اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے، نہ ریاستی سطح پر اِس کا بندوبست ہوتا ہے اور نہ معاشرتی ماحول کوئی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ مسئلہ بارہا جناب جاوید احمد غامدی کے سامنے رکھا گیا ہے۔ اِس کے جواب میں اُنھوں نے جو گفتگو کی اور اس کے حل کے لیے جو تجاویز دی ہیں، اُنھیں سید منظور الحسن نے ایک مضمون کی صورت میں تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون ''اشراق امریکہ'' کے ستمبر 2023 کے شمارے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کی آڈیو ادارے کے یوٹیوب چینل پر سنی جاسکتی ہے۔

''البیان'' اور ''میزان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

غامدی صاحب کی تفسیر قرآن ''البیان'' اور اسلام پر ان کی کتاب ''میزان'' کی انگریزی زبان میں تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ پچھلے ماہ ''البیان'' کی 4 نشستوں کا انعقاد ہوا، جن میں سورۂ بقرہ کی آیات 83 تا 121 زیر بحث آئیں۔ ''میزان'' سیریز کے تحت ''The Political Shariah'' اور ''The Economic Shariah'' کے عنوان سے ڈاکٹر شہزاد سلیم نے دو لیکچرز ریکارڈ کیے۔ یہ لیکچرز غامدی سینٹر کے

یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

''کچھ نئے کچھ پرانے اعتراضات''

محمد حسن الیاس صاحب نے اپنے دورۂ پاکستان کے دوران میں سید محمد شاہ کاظمی کے ساتھ ''کچھ نئے کچھ پرانے اعتراضات'' کے عنوان سے ایک پروگرام ریکارڈ کروایا، جس میں الحاد اور خدا کے وجود پر اٹھنے والے سوالوں کے جواب دیے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جلد ہی جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے ساتھ الحاد کے موضوع پر ایک ویڈیو سیریز کا آغاز کیا جائے گا، جس میں خدا کے وجود سے متعلق پیدا ہونے والے سوالات اور الحاد کے ایک ایک پہلو کو زیر بحث لایا جائے گا۔ یہ پروگرام ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مزید برآں انھوں نے پاکستان میں روایتی اسکالرز، یونیورسٹی کے پروفیسرز اور علما سے ملاقاتیں بھی کیں۔

ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث

جی سی آئی ایل کے زیر اہتمام جناب جاوید احمد غامدی کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کا سلسلہ جاری ہے۔ ماہ ستمبر میں 15 نشستوں کا انعقاد ہوا۔ غامدی صاحب نے ان نشستوں میں سورۂ نحل (16) کی آیات 65 تا 90 کا درس دیا۔ درسِ حدیث میں ''اخلاقیات'' کے تحت آنے والے متعدد موضوعات پر مختلف احادیث کی شرح و وضاحت کی گئی۔ قرآن و حدیث کا یہ درس غامدی سینٹر کے یوٹیوب پر چینل پر موجود ہے۔

''رازِ حیات''

''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' کے ریسرچ اسکالر اور ماہنامہ ''اشراق'' امریکہ کے مدیر سید منظور الحسن صاحب عرصۂ دراز سے اپنے قلم کے ذریعے سے فکر اسلامی کی ترویج و توسیع کا کام کر رہے ہیں۔ ان کی تصنیف کا دائرہ غامدی صاحب کے افکار کی شرح و وضاحت ہے۔ اب انھوں نے منتخب موضوعات پر گفتگوؤں کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ ''رازِ حیات'' اسی سلسلے کا ہفتہ وار پروگرام ہے، جو ہر پیر کو پاکستانی وقت کے مطابق 7 بجے رات یوٹیوب چینل سے نشر ہوتا ہے۔ اِس میں انسان کے اخلاق و کردار کی تعمیر کو ہدف بنایا گیا ہے۔ مختصر دورانیے کی گفتگوؤں میں عام

فہم انداز میں بات کو سمجھایا جاتا ہے۔ گذشتہ ماہ جو اپی سوڈ نشر ہوئے ان کے عنوان ہیں: ''ذمہ دار اور غیر ذمہ دار افراد کون ہوتے ہیں؟'' اور ''دلوں پر مہر لگنے سے کیا مراد ہے؟'' یہ پروگرام غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

''ربیع الاول''

جناب حسن الیاس صاحب نے اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے متعلق بعض غلط تصورات کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ آپ کی ذاتِ بابرکات کے حوالے سے یہ تصورات صحیح نہیں ہیں کہ ''یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بنائی تھی۔''، ''رسول اللہ سے عشق ہی جنت میں لے جائے گا۔''، ''سارے نبی تیرے در کے سوالی'' اور ''حاضر و ناظر''۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ ان تصورات کا دین سے کوئی تعلق نہیں اور یہ محض مسلمانوں کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں۔ انھوں نے مزید واضح کیا کہ آپ کی ذاتِ اقدس سے محبت و عقیدت کا تعلق اُسی ہدایت کے مطابق استوار ہونا چاہیے، جو قرآن و سنت کے مطابق ہے اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں مطلوب ہے۔ یہ مضمون ''اشراق امریکہ'' کے ستمبر 2023 کے شمارے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم کے مختلف لیکچرز کی ریکارڈنگ

ستمبر 2023 میں ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب نے ''اسلام کے سیاسی احکام'' اور ''اسلامی سزائیں'' کے عنوان سے دو لیکچر ریکارڈ کروائے۔ Lessons of Life Series کے زیر عنوان 6 لیکچرز ریکارڈ ہوئے۔ ان کے موضوعات ''دوسروں پر تنقید کے آداب''، ''والدین کے آنسو''، ''بچوں کے وعدے''، ''دکھاوا اور خود نمائی''، ''باطنی سکون کا راز''، ''دشمنوں کو دوست بنانا'' ہیں۔ یہ لیکچرز انگریزی زبان میں ہیں اور غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

بحرین میں غامدی صاحب کا چار روزہ قیام

گذشتہ ماہ جناب جاوید احمد غامدی اور حسن الیاس صاحب نے بحرین کا دورہ بھی کیا۔ اس دورے میں ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ'' کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر فرحان سید بھی ان کے ہم راہ

تھے۔ بحرین میں ان کا چار روزہ قیام تھا۔ اس دورے میں پانچ مختلف نشستیں ہوئیں جن میں سعودی عرب سے آئے لوگوں نے بھی شرکت کی اور مستقبل میں بحرین میں مختلف دینی اور دعوتی پروگرامز کے انعقاد کے حوالے سے بھی بات چیت کی گئی۔ غامدی صاحب کا بحرین کا یہ پہلا دورہ تھا۔

''حیاتِ امین''

یہ جلیل القدر عالم دین، مفسر قرآن اور مدرسۂ فراہی کے عظیم محقق امام امین احسن اصلاحی کی سوانح حیات ہے۔ اس کا مقصد مولانا کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی علمی اور فکری میراث سے آنے والی نسلوں کو واقف کرانا ہے۔ اس کام کے لیے ''المورد امریکہ'' کے اسکالر نعیم احمد بلوچ کی خدمات کو مختص کیا گیا ہے۔ اس کی پہلی قسط ماہنامہ ''اشراق امریکہ'' کے ستمبر 2023 کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں مصنف نے مولانا کی جاے پیدایش، تاریخ پیدایش، خاندان، گھریلو ماحول، ابتدائی تعلیم اور مولانا کے بچپن کے واقعات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

''سوال و جواب سید منظور الحسن کے ساتھ''

یہ غامدی سینٹر کا نیا ہفتہ وار پروگرام ہے، جو ہر جمعہ کے روز پاکستانی وقت کے مطابق رات 9 بجے نشر ہوتا ہے۔ اس پروگرام کے میزبان سید حاشر حسن ہیں جو نوجوانوں کے ذہنوں میں اسلام کے متعلق اٹھنے والے سوالوں کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سیاسی معاملات کو منظور صاحب کے سامنے رکھتے ہیں اور منظور صاحب دین و اخلاق کی روشنی میں ان کے جواب دیتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کے چار پروگرام نشر کیے گئے۔ ان کے عنوانات یہ ہیں: ''پڑھے لکھے نوجوانوں کا دین پر اعتماد کیوں ختم ہو رہا ہے اور اس کا قصوروار کون ہے؟ کیا قرآن واقعی اللہ کی کتاب ہے؟ نوجوانوں کی دین سے دوری کے کیا اسباب ہیں؟ عرس کیوں منایا جاتا ہے؟ یہ اپنی سوڈ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

فلپائن میں غامدی صاحب کا مختصر قیام

جناب جاوید احمد غامدی اور محمد حسن الیاس صاحب نے دعوتی سرگرمیوں کے سلسلے میں ماہ ستمبر میں مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ اپنے دورۂ پاکستان کے بعد انھوں نے بحرین میں مختصر قیام کیا اور وہاں سے آسٹریلیا جاتے ہوئے فلپائن میں کچھ گھنٹوں کے لیے رکے۔ فلپائن میں مقامی پاکستانی

احباب نے اطلاع ملتے ہی جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا استقبال کرتے ہوئے بے لوث محبت کا اظہار کیا۔ سوال و جواب کی نشست کے ساتھ ساتھ پر تکلف عشائیے کا بھی اہتمام تھا۔ اس موقع پر مقامی دیوبندی علما نے بھی بہت عزت افزائی فرمائی۔ پاکستانی سفارت خانے کے تمام احباب بھی اس موقع پر موجود تھے۔

نوجوانوں کی دینی تربیت

نوجوان نسل ہمارا مستقبل ہے۔ اُس کے ذہن میں اٹھنے والے دینی اور فکری سوالات کا جواب اہل علم کی ذمہ داری ہے۔ اِسی مقصد کے پیش نظر ”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ“ وقتاً فوقتاً اہل علم و دانش کو مدعو کر کے اُن کے ساتھ نوجوانوں کے مکالموں کا اہتمام کرتا ہے۔ اِس ضمن میں ”قرآن اور زندگی کا معما“ کے موضوع پر محمد بشار الیاس کی میزبانی میں ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب کے ساتھ پروگرام ریکارڈ کیے گئے۔ اس میں نئی نسل کے قرآن مجید اور دین پر اٹھنے والے سوالات کو بے تکلف انداز میں زیر بحث لایا گیا۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب نے شارق بٹ صاحب کے ساتھ انگریزی میں بھی تبادلۂ خیال کیا تاکہ انگریزی سمجھنے والے نوجوان بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ ستمبر 2023 میں اس موضوع پر دو پروگرام نشر کیے گئے، جو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل سے نشر ہو رہی ہے۔

”بھلا تو نے دیکھا تھا دل چیر کر؟“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی منظوم ترجمانی کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ سید منظور الحسن نے فضائل اخلاق پر مبنی حدیثوں کو نظم کی صورت میں ڈھالا ہے۔ یہ نظمیں جناب جاوید احمد غامدی کی نظر ثانی سے بھی گزری ہیں۔ یہ کام بچوں کی دینی تعلیم کے لیے ہے، لہٰذا اِن نظموں کا اسلوب عام فہم ہے۔ ستمبر کے ”اشراق امریکہ“ میں صحیح مسلم کی ایک روایت کی منظوم ترجمانی شائع ہوئی ہے۔ اِس کا عنوان ہے: ”بھلا تو نے دیکھا تھا دل چیر کر؟“۔ نظم کے آخری دو شعر یہ ہیں:

زُباں سے جو خود کو مسلماں کہے
رسالت پہ ایماں کو ظاہر کرے

ہمیں اُس کی تکفیر کا حق نہیں
یہی اصلِ دیں ہے، یہی شرحِ دیں

ہفتہ وار سوال وجواب کی نشست

غامدی سینٹر میں ستمبر کے مہینے کی ہفتہ وار سوال و جواب کی نشست کا انعقاد ہوا۔ سوال و جواب کی اس نشست میں ''سیدنا علی اور امیر معاویہ، یزید اور واقعہ کربلا''، ''ولی عہد کی بحث، معاویہ اور یزید کا تقرر'' جیسے اہم موضوعات کو زیر بحث لایا گیا۔ سوال و جواب کی ہفتہ وار ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب کے نجی مشاورتی سیشن

گذشتہ ماہ مختلف لوگوں نے ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب سے نجی طور پر ملاقات کی۔ ان ملاقاتوں میں لوگوں نے ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نو عمری اور ازدواجی مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

''اشراق امریکہ'' کا انگریزی ورژن

''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' کی تمام علمی اور دعوتی سرگرمیاں ابلاغ کے جدید ذرائع کو مد نظر رکھتے ہوئے انجام دی جاتی ہیں۔ موجودہ دور میں انگریزی زبان کو عالمی سطح پر ذرائع ابلاغ کے لیے ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی زبان کی اس اہمیت کے پیش نظر ''المورد امریکہ'' نے ''اشراق امریکہ'' کو انگریزی میں بھی شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تاکہ انگریزی جاننے والوں کی ایک بڑی تعداد بھی مدرسۂ فراہی کے علمی اور فکری لٹریچر سے مستفید ہو سکے۔ اس پر کام جاری ہے اور جلد ہی ''اشراق امریکہ'' کا انگریزی ورژن بھی مطالعے کے لیے دستیاب ہو گا۔

Ask Dr. Shahzad Saleem

یہ سوال وجواب کی لائیو ماہانہ نشست ہے، جس میں ڈاکٹر شہزاد سلیم لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔

اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ اس کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ'' سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 3 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں محمد حسن الیاس نے جاری کیا۔

''اسلام اسٹڈی سرکل''

ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب نے ''اسلام اسٹڈی سرکل'' کے عنوان سے ایک سیشن کا آغاز کیا ہے۔ اس میں وہ مختلف دینی، اخلاقی اور سماجی موضوعات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کرتے ہیں۔ یہ سیشن تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قرآن مجید کی آیات سے ایک موضوع منتخب کر کے اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ دوسرے حصے میں منتخب احادیث نبوی پر گفتگو ہوتی ہے۔ تیسرے حصے میں بائیبل کے کسی اقتباس کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ پروگرام کے آخر میں موضوع سے متعلق سوالوں کے جواب بھی دیے جاتے ہیں۔ پچھلے مہینے کے سیشن میں ''سچائی''، ''ہمدردی''، ''عفو و درگزر'' اور ''تکبر پر قابو پانا'' جیسے موضوعات زیر بحث رہے۔ یہ سیشن انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ ان کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

Ask Ghamidi

پچھلے ماہ اگست میں Ask Ghamidi کی 32 ویں نشست ہوئی۔ یہ آن لائن نشست ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہنوں میں اٹھنے والے دینی اور اخلاقی موضوعات سے متعلق مختلف سوالوں کے جوابات براہ راست غامدی صاحب سے حاصل کر سکیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اس نشست میں حصہ لیا۔

انگریزی ترجمۂ قرآن کا تعارف

امام العصر جناب جاوید احمد غامدی کا ترجمۂ قرآن تراجم کی تاریخ میں اس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے جس میں قرآن کا نظم اس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور میں انگریزی زبان کی اہمیت کے پیش نظر ''المورد امریکہ'' نے یہ ضروری سمجھا کہ مدرسۂ فراہی کی عظیم دریافت، یعنی نظم قرآن کو انگریزی زبان کے جاننے والوں تک پہنچایا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر ''المورد امریکہ'' کے اسکالر ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب نے غامدی صاحب کے ترجمۂ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ''المورد امریکہ'' نے گذشتہ برس شکاگو میں ایک نشست کا اہتمام کیا جس میں ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب نے انگریزی میں کیے گئے ترجمۂ قرآن کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے اس کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس کی بنیاد پر یہ باقی تراجم سے منفرد حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

دنیانیوز کے لیے ''علم و حکمت'' کے پروگراموں کی ریکارڈنگ

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ'' دنیانیوز چینل پاکستان کا ایک معروف پروگرام ہے، جو کئی برس سے نشر ہو رہا ہے۔ یہ ڈیلس میں ریکارڈ ہوتا ہے اور ہفتہ وار نشر ہوتا ہے۔ میزبانی کے فرائض حسن الیاس صاحب انجام دیتے ہیں۔ ستمبر 23 میں 4 پروگرام ریکارڈ کیے گئے اور دنیانیوز سے نشر ہوئے۔ ان پروگراموں میں احتجاج کی اخلاقیات، قومی ریاست کا قیام اور اس کے عناصر اور قومی ریاست میں حکومت کی نوعیت جیسے اہم موضوعات پر گفتگو کی گئی اور ناظرین کی طرف سے بھیجے گئے متفرق سوالوں کے جواب دیے گئے۔

الطاف احمد اعظمی کی وفات

الطاف احمد اعظمی صاحب مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ کے فارغ التحصیل تھے۔ طبیب بھی تھے۔ جامعۂ ہمدرد سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ مدرسۃ الاصلاح کو اس خطے کے جلیل القدر عالم امام حمید الدین فراہی کے ساتھ نسبت ہے۔ اگست 2023 بروز اتوار وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ''اشراق امریکہ'' کے ستمبر کے شمارے میں ان کی وفات پر جناب خورشید ندیم، محمد عطریف شہباز اور محمد مرسلین اصلاحی کے مضامین شائع ہوئے۔ مصنفین نے مرحوم کی علمی، ادبی اور دینی

خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات، تصانیف اور شعری مجموعے کے محاسن کا ذکر کیا اور ان کے شخصی محاسن بیان کرتے ہوئے لکھا کہ سوچنا اور سوال اٹھانا الطاف احمد اعظمی کی فطرت میں شامل تھا اور بے لاگ انداز میں جو سمجھتے تھے اس کا اظہار کر دیتے۔ اور غالباً یہی چیز ہے جس کی وجہ سے ان میں علمی تواضع وانکساری کم اور حد درجہ خود اعتمادی و بے پناہ جرأتِ اظہار پائی جاتی تھی۔ یہ مضامین "اشراق امریکہ" کے ستمبر 2023 کے شمارے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اوساکا، جاپان میں ڈاکٹر شہزاد سلیم کا لیکچر

ڈاکٹر شہزاد سلیم نے پچھلے ماہ جاپان کے شہر اوساکا میں طلبا کو "اسلام اور ریاست: عام غلط فہمی" کے موضوع پر لیکچر دیا۔ اس لیکچر میں طلبا کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔